

تعلیم و تربیت

اکتوبر 2015

رنگ برنگی اور بیماری پیری

شہابیہ

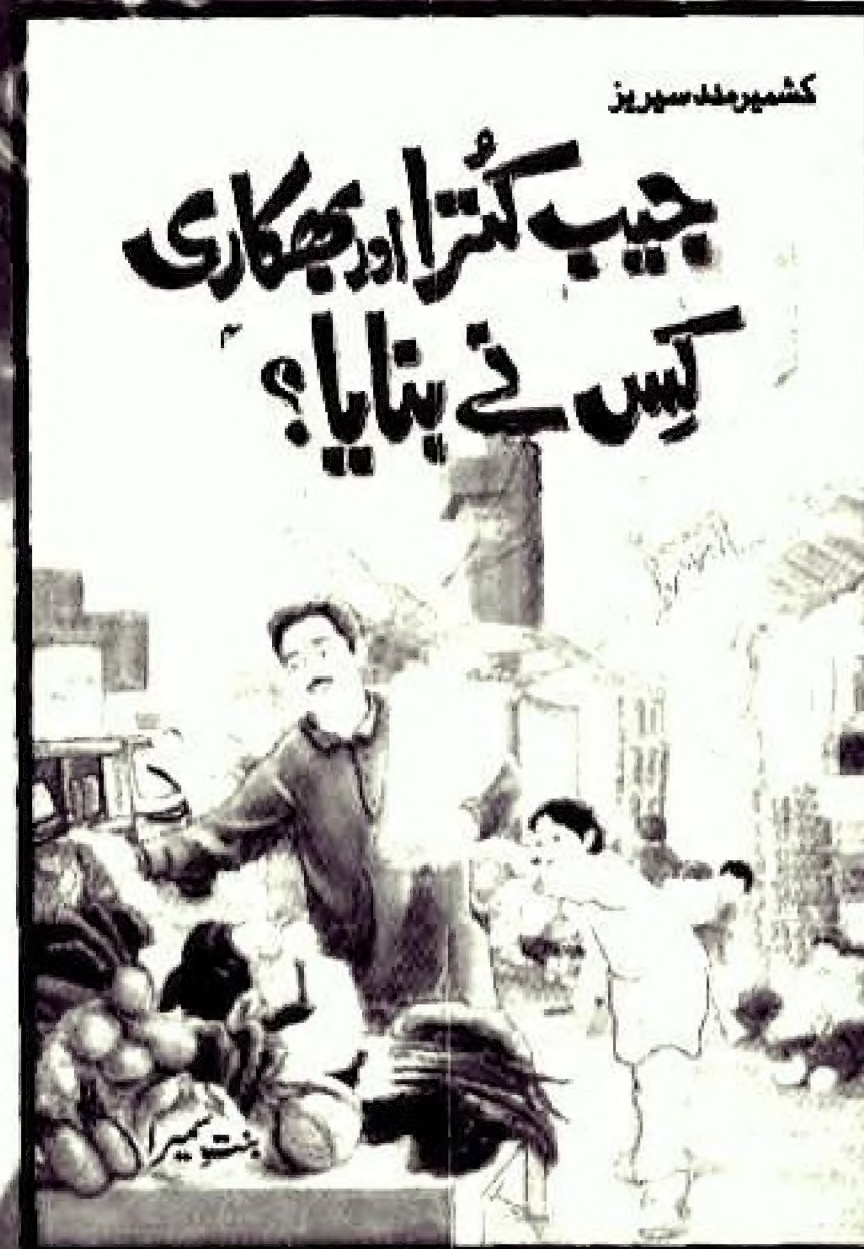
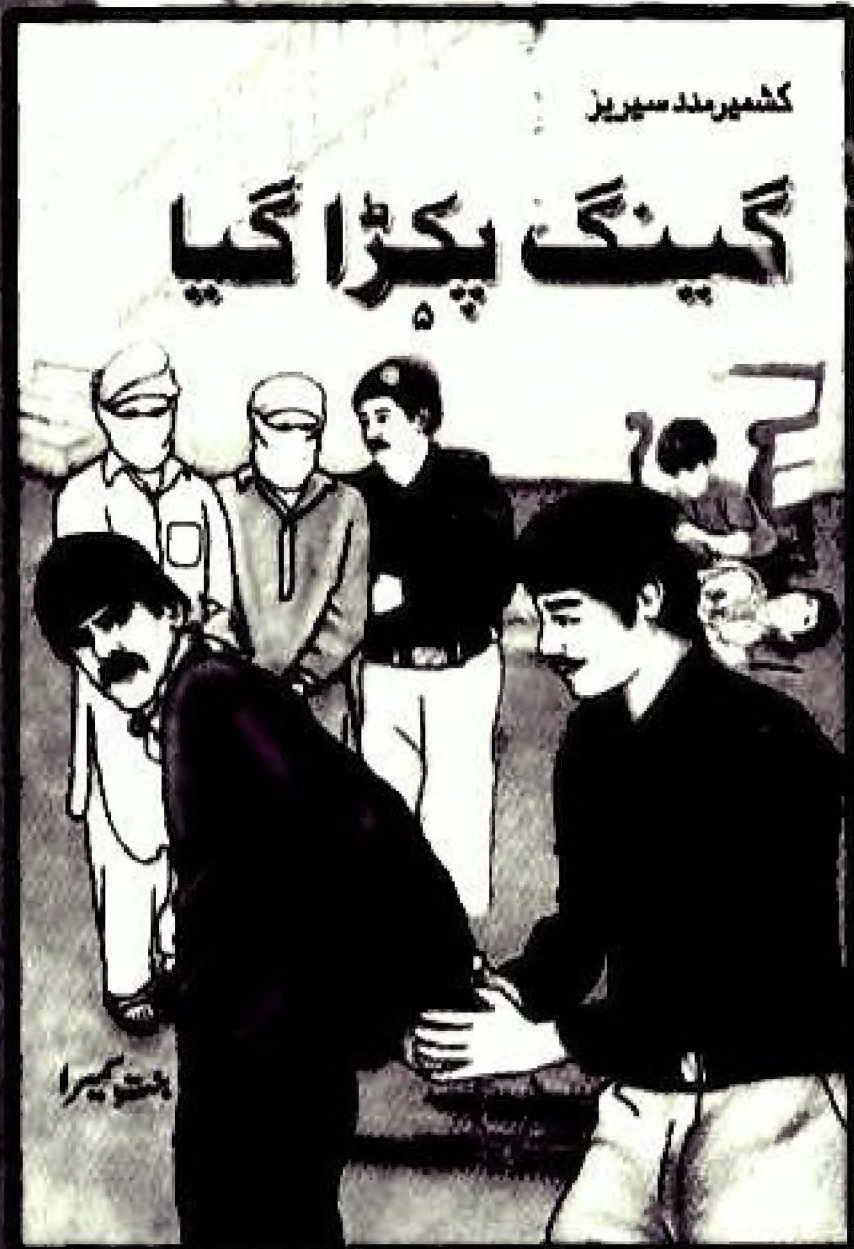
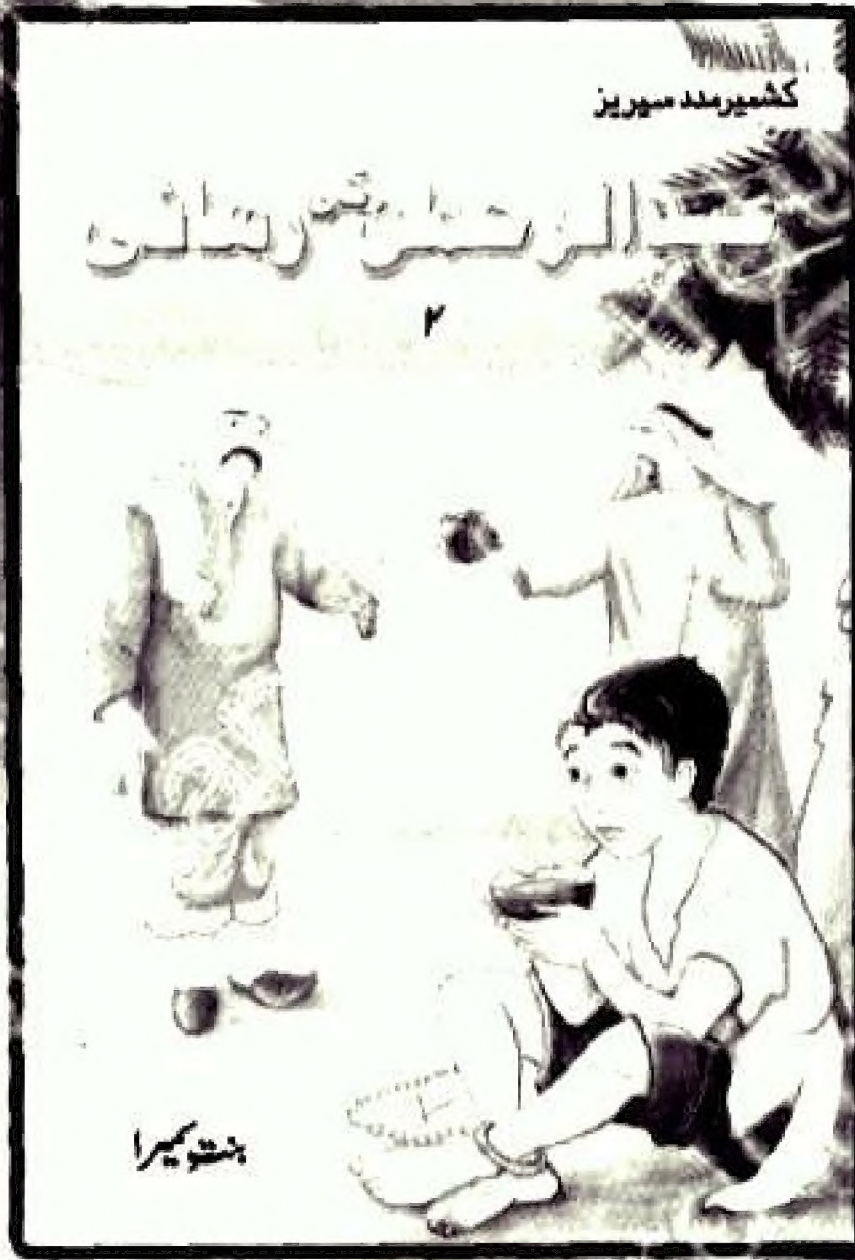
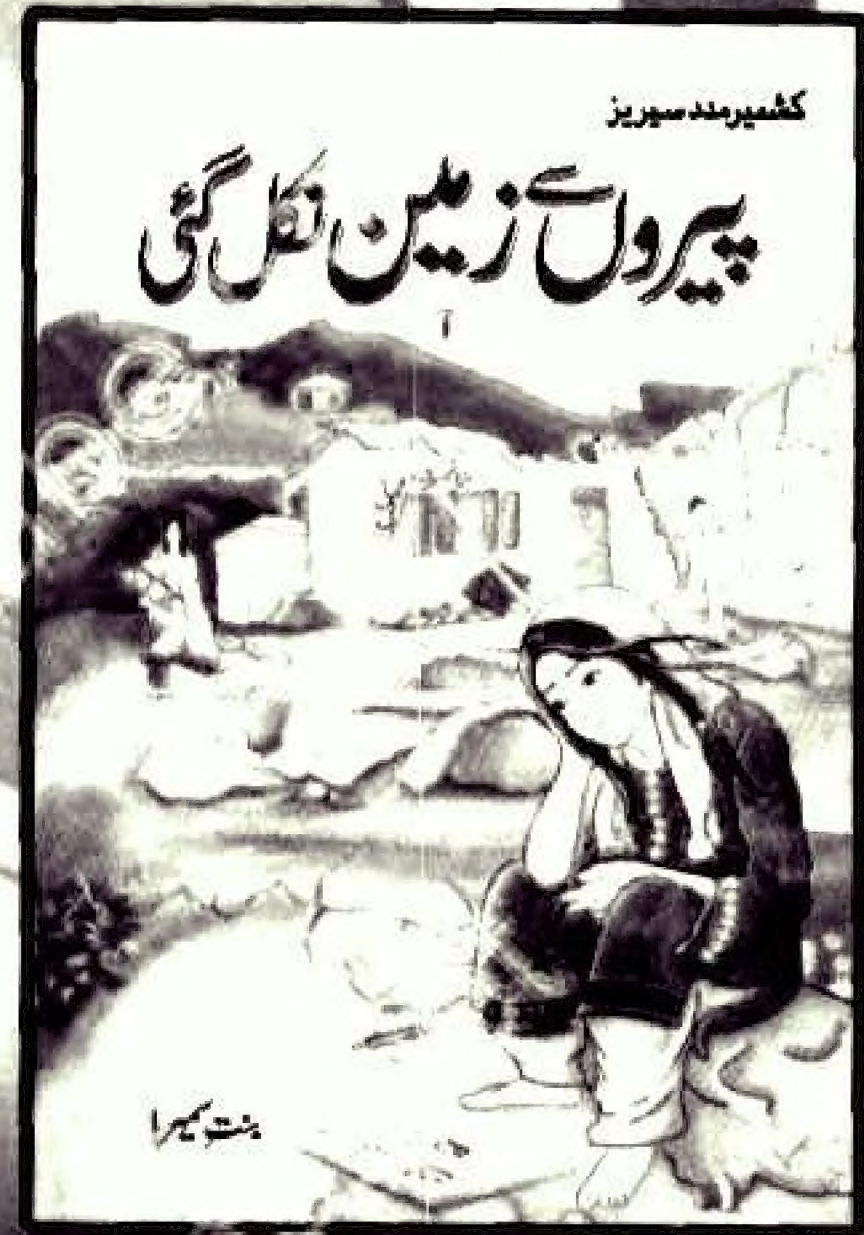
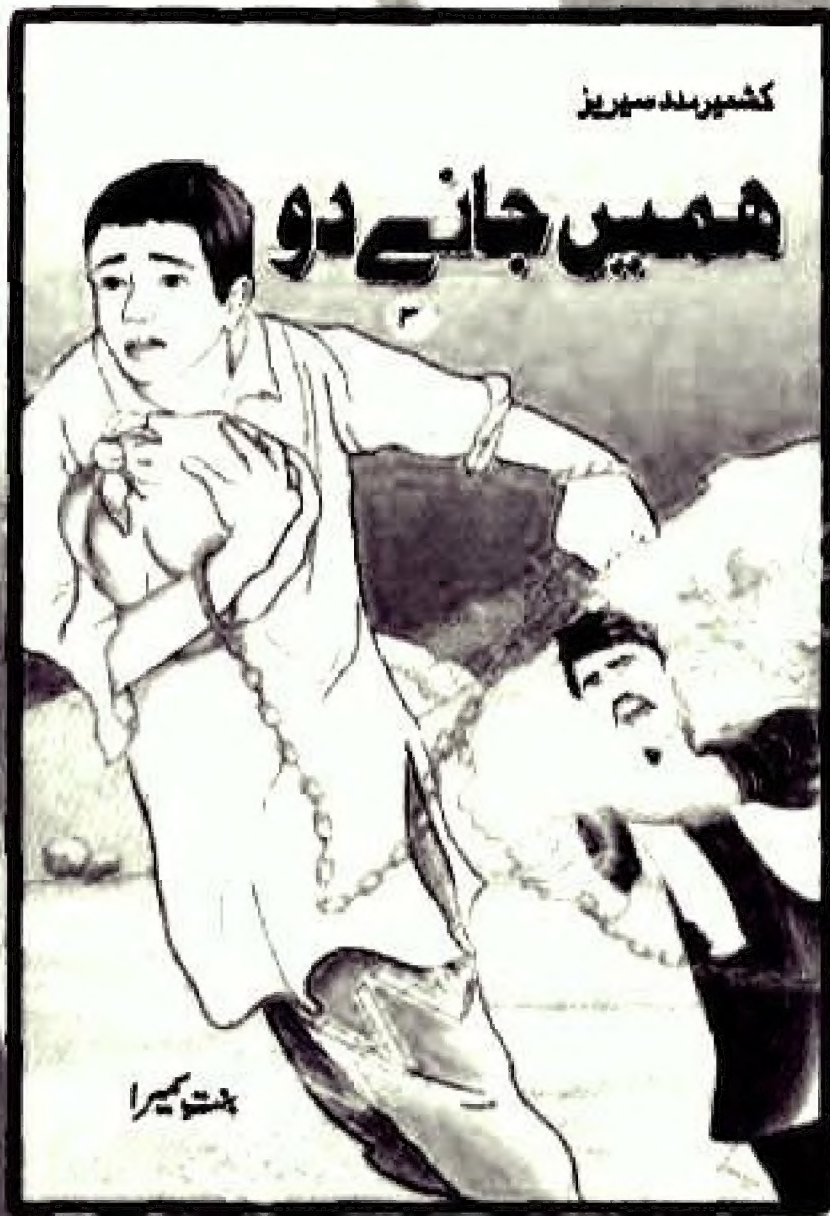
صفحہ نمبر 62

PDFBOOKSFREE.PK



کشمیر ملد سیریز

فیروز ستر کی یوتھ کلب سیریز کے ممبران کے نئے اور دلچسپ کارنامے



فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

تعلیم و تربیت

اس شمارے میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! جنگل میں کسی ندی میں ایک مینڈک رہتا تھا اور ندی کے کنارے ایک بل میں چوہا بھی رہائش پزیر تھا۔ دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ انہوں نے ایک وقت مقرر کیا ہوا تھا جب وہ دونوں اکٹھے ہو کر گپ شپ کرتے اور دل کا دکھ درد بانٹتے۔ ان کا آپس میں باہمی میل ملاپ اور یارانہ اتنا بڑھا کہ ایک دن مینڈک نے اپنے دوست چوہے سے دل کی بات کہہ ڈالی کہ ہماری ذاتی ہم آہنگی اور بے لوث دوستی اس قدر اہم ہے کہ اس تھوڑے سے وقت میں دل کی باتیں کرنا اور باہمی مشکلات کا حل مل کر ازالہ کرنا دونوں کے لیے ناممکن ہے، لہذا کوئی ایسی صورت حال نکالنی چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے یا بوقت ضرورت ایک دوسرے کو مل سکیں۔ ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ میں پانی میں رہتا ہوں اور آپ خشکی پر رہتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر کوئی ایسی ترکیب نکالیں کہ ضرورت پڑنے پر ہم ایک دوسرے سے مل سکیں۔

چوہے نے مینڈک سے کہا کہ میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے، اگر آپ اتفاق کریں تو ہم اپنے مسئلے کا حل نکال سکتے ہیں۔ مینڈک نے بڑی بے قراری اور دل چسپی سے کہا: ”ارشاد فرمائیں! کیا تدبیر ہے؟“

چوہے نے کہا کہ اس مقصد کے لیے اگر ہم ایک باریک ری کے دونوں سرے ایک دوسرے کے پاؤں کو باندھ دیں اور جب ملنے کی ضرورت محسوس ہو تو اپنے پاؤں سے ری کو کھینچیں تو پتا چل سکتا ہے کہ ہم میں ری کھینچنے والا دوسرے کو بلا رہا ہے۔

اگرچہ چوہے کی یہ منصوبہ بندی مینڈک کو پسند نہ آئی لیکن دوستی کی خاطر اس نے سب کچھ قبول کر لیا اور یوں وہ حسبِ خواہش آپس میں خوب ملاقاتیں کرنے لگے۔

چوہے اور مینڈک کا وقت بہت خوشی سے گزر رہا تھا لیکن شامی اعمال کہ ایک دن چوہا اپنی بل سے باہر تھا اور کسی عقاب کی نظر اس پر پڑی تو اس نے نہایت تیزی سے اڑان لیتے ہوئے چوہے کو آدبوج لیا۔ چوہے اور مینڈک دونوں کے پاؤں باریک ری سے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، جب عقاب اپنے بچوں میں چوہے کو لے کر فضا میں بلند ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ ری کے دوسرے سرے پر مینڈک بھی ساتھ بندھا ہوا، ہاتھ پاؤں چلاتا فضا میں بلند ہو رہا ہے۔ لوگوں کو ایک عجیب تماشا دیکھنے کو ملا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ عقاب نے مینڈک کو پانی میں سے کیسے پکڑ لیا، جب کہ چوہا لوگوں سے یہ فریاد کیے جا رہا تھا کہ لوگو! دیکھو، یہ سزا ناجس اور نااہل سے دوستی کا نتیجہ ہے جس کی مجھے سزا ملی۔ خدا کے لیے محبت، دوستی میں ایسی بے قراری سے ڈور رہیے اور نااہل سے دوستی مت کیجیے۔

شہید ملت لیاقت علی خاں پاکستان کے پہلے وزیراعظم تھے۔ آپ یکم اکتوبر 1895ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک با اصول اور ایمان دار سیاست دان تھے۔ اس کے علاوہ آپ قائداعظم کے با اعتماد ساتھی تھے۔ لیاقت علی خاں کو 16 اکتوبر 1951ء کو راول پنڈی کے ایک جلسے میں اکبر نامی شقی القلم شمس نے گولی مار کر شہید کر دیا۔ انہیں پاکستان سے بہت محبت تھی۔ ان کی پاکستان کے لیے خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیشہ کی طرح ہمیں بے شمار خطوط، ای میلز اور فون کالز موصول ہوتی ہیں۔ ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ شہروں، پہاڑوں، میدانوں، صحراؤں، دور دراز علاقوں، اندرون ملک و بیرون ملک سچے تعلیم و تربیت بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہم اپنے تمام قارئین کا پُر تپاک شکر یہ ادا کرتے ہیں۔ آئندہ شمارے تک کی اجازت چاہتے ہیں۔ اپنا اور دوسروں کا بہت سا خیال رکھیے گا۔

فی ابان اللہ (ایڈیٹر)

سرکولیشن اسٹنٹ

محمد بشیر راہی

اسٹنٹ ایڈیٹر

عابدہ اصغر

ایڈیٹر، پبلشر

ظہیر سلام

اور بہت سے دل چپ تراشے اور سلیس سرورق: ”تہلیاں“

1	اداریہ
2	محمد و نعت
3	در قرآن و حدیث
4	حضرت عائشہ صدیقہ
6	ایک انڈیا ایک نوالہ
10	محمد فاروق دانش
11	ادارہ
15	سبز پہاڑ کا جوجی
19	زہیدہ سلطانہ
21	چند ترکان
22	ریحان خورشید
23	کبڈی اور رگبی ڈھڑا
24	رانا محمد شاہد
25	یارے اللہ کے.....
26	راشد علی نواب شاہی
27	بوجھو جانیں
28	نئے قارئین
29	حضرت یازید بسطامی اکوہن
30	ادب و نعت
31	میری زندگی کے مقاصد
32	پرعزم قارئین
33	مختصر مختصر
34	نئے لکھاری
35	ذائقہ کار
36	بچوں کا انسائیکلو پیڈیا
37	ڈاکٹر طارق ریاض
38	آپ زم زم
39	عادہ کہانی
40	زہیدہ سلطانہ
41	سرسید احمد خان
42	غلام حسین یمن
43	آئیے مسکرائیے
44	باقی قارئین
45	کھوج لگائیے
46	نئے قومی
47	سید لخت
48	ہائے اللہ ساپا
49	محمد اسلم
50	جانتیں
51	بے نور
52	لامیہ میراجوان
53	آپ بھی لکھیے
54	نئے ادیب
55	خیر ہے نویشن
56	روشن سیمینکل بگل
57	میری بیاض سے
58	پندیدہ اشعار
59	ایڈیٹر کی ڈاک
60	برف کی ملکہ
61	احمد عدنان طارق
62	تہلیاں
63	شیخ عبدالحمید عابد
64	گورکھ۔ سندھ کا مری
65	بلا متوان

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایڈیٹر رولڈ لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live.com

پر عتر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بچے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32۔ ایڈیٹر رولڈ لاہور کے ہیچ پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36278816 فکس: 36361309-36361310

ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 850 روپے۔
مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔

قیمت نیچے
30 روپے

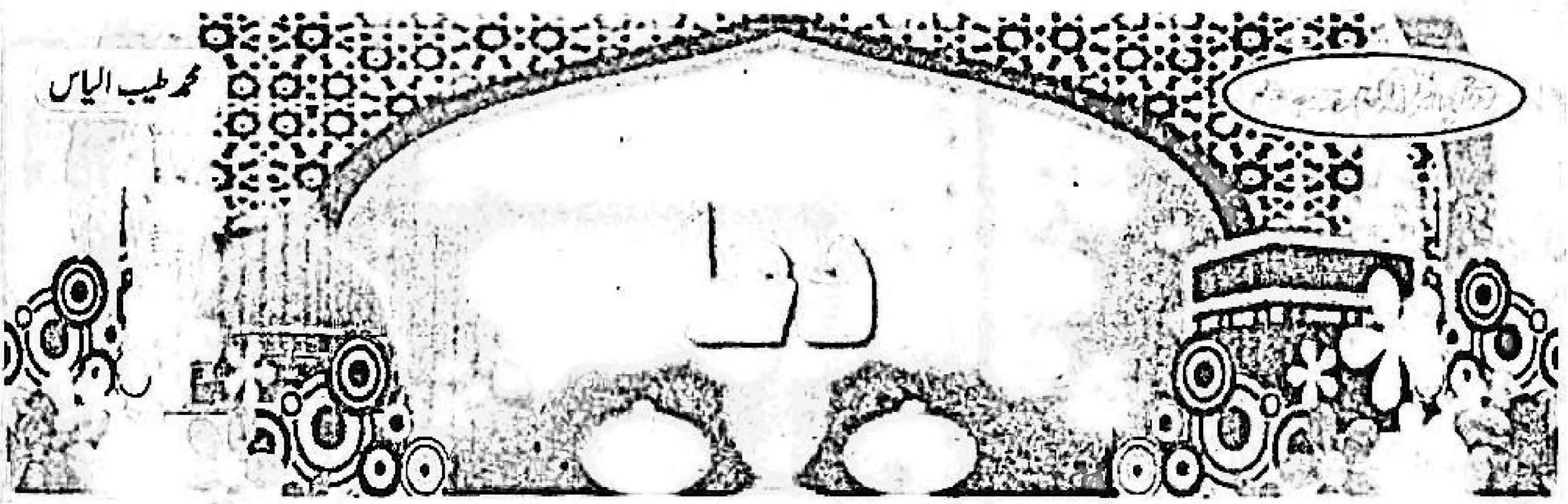


نعت رسول مقبول ﷺ

تذکرہ جب کریں محمدؐ کا
مرتبہ جان لیں محمدؐ کا
پہلے بھیجیں درود ہم اُن پر
بعد میں نام لیں محمدؐ کا
بزم میں ، رزم میں کہیں جائیں
ذکر کرتے چلیں محمدؐ کا
یہی تسبیح سب سے افضل ہے
نام لیتے رہیں محمدؐ کا
سینکڑوں مشکوں کے حل کے لیے
ایک کلمہ پڑھیں محمدؐ کا
حمد حق ہو زبان پر جاری
دم ہمیشہ بھریں محمدؐ کا
شرع کی پیروی کریں دل سے
سر میں سودا رکھیں محمدؐ کا
دین اسلام کا کریں چرچا
سب کو پیغام دیں محمدؐ کا



انسان کا ظلم دور کرے، اس کے سوا کون
مغموم کو سرور کرے، اس کے سوا کون
ہر شخص کو دیتا ہے سکون کون یہاں پر
دل خوشیوں سے معمور کرے، اس کے سوا کون
وہ کون ہے جو قبر کی قلت سے بچائے
بیدا وہاں بھی نور کرے، اس کے سوا کون
نیکی کی محبت جو خدا دل میں نہ ڈالے
پھر نیکی پہ مجبور کرے، اس کے سوا کون
ہے کون جو ظالموں کو ظلم سے روکے
عام امن کا دستور کرے، اس کے سوا کون
وہ کون ہے جو بدحال کو خوش حال بنائے
افلاس کو کافور کرے، اس کے سوا کون
وہ کون ہے جو توبہ کی توفیق بھی بخشے
پھر توبہ کو منظور کرے، اس کے سوا کون
چنگیز و ہلاکو سے ستم گاروں کو اکو
انصاف پہ مامور کرے، اس کے سوا کون
وہ کون ہے جو سب کا خطا پوش ہے، بڑی
در عیب کو مستور کرے، اس کے سوا کون



والی بلا اور مصیبت ٹال دیتے ہیں یا اس دعا کو ہمارے گناہوں کا کفارہ بنا دیتے ہیں۔ ہم اس راز سے بے خبر ہوتے ہیں۔
(3) اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنا دیتے ہیں۔ یعنی ہم جس مقصد کے لیے دعا کرتے ہیں وہ تو اس دنیا میں پورا نہیں ہوتا، لیکن اس کے بدلہ میں آخرت کا بہت بڑا ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔
ایک حدیث میں ہے کہ ”بعض لوگ جن کی بہت سی دعائیں دنیا میں قبول نہیں ہوئی ہوں گی، جب آخرت میں پہنچ کر اپنی ان دعاؤں کے بدلے میں ملے ہوئے ثواب اور نعمتوں کے ذخیرے دیکھیں گے تو حسرت سے کہیں گے کہ: کاش! دنیا میں ہماری کوئی دعا بھی قبول نہ ہوئی ہوتی اور سب کا بدلہ ہمیں یہیں ملتا۔“

(مشترک حاکم، کتاب الدعاء 1819)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”دعا عبادت کا مغز ہے۔“

(ترمذی، ابواب الدعوات: 3371)

اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا وہ عمل ہے جس سے ایک طرف ہماری حاجتیں پوری ہوتی ہیں اور دوسری طرف وہ بذات خود ایک عظیم عبادت بھی ہے، بلکہ عبادت کا مغز ہے جس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔ جب اجر و ثواب ملنا یقینی ہے تو پھر کوئی دعا کسی صورت میں رائیگاں نہیں جاتی۔ البتہ دعا مانگنے میں اس بات کا خیال رہے کہ کسی بڑے اور ناجائز کام کے لیے دعا نہ کرے کیوں کہ یہ عبادت نہ رہے گی، گناہ بن جائے گا۔ اسی طرح قطع رحمی کی دعا بھی نہ کرے۔ اپنے عزیز و اقارب سے اچھے تعلقات رکھنے اور حسن سلوک سے پیش آنے کو ”صلہ رحمی“ اور ان سے تعلقات بگاڑنے اور بدسلوکی سے پیش آنے کو ”قطع رحمی“ کہتے ہیں، جو کہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔

پیارے بچو! عاجزی، توجہ اور یقین..... کے ساتھ کی جانے والی دعا کے قبول ہونے کی زیادہ امید ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو دعا میں ضرور اختیار کیجئے۔ ☆☆☆

پیارے بچو! دنیا کا سارا نظام اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے چل رہا ہے اور سب کچھ اسی کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ ہمارا ہر چھوٹی اور بڑی ضرورت میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بالکل فطری بات ہے۔ ہر مذہب کے ماننے والے اپنی ضروریات اور حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں لیکن دین اسلام میں اس کی خاص طریقہ سے تعلیم اور تاکید فرمائی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد ہے کہ ”اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: مجھے پکارو، میں تمہاری دعا نہیں قبول کروں گا۔“ (المومن: 60)

اللہ رب العزت کا ہم پر کتنا بڑا احسان اور انعام ہے کہ ہمیں اپنی بلند ذات سے مانگنے کی اجازت دے دی اور پھر دعا قبول کرنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ اس لیے ہمیشہ دعا کرتے رہنا چاہیے۔ اگر چند بار دعا مانگنے سے مقصد پورا نہ ہو تو بھی مایوس اور ناامید ہو کر دعا ہرگز نہ چھوڑے، کیوں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور وہ ہمارے مالک و آقا ہیں۔ بندہ ہمیشہ اپنے مالک و آقا کے تابع و مطیع رہتا ہے اور اس کے احکامات کا پابند ہوتا ہے اور اپنی ضروریات کا اسی سے سوال کرتا ہے۔ پس ہمارا کام دعا مانگنا اور اس کے سامنے عاجزی ظاہر کرنا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق فیصلہ فرماتا ہے۔

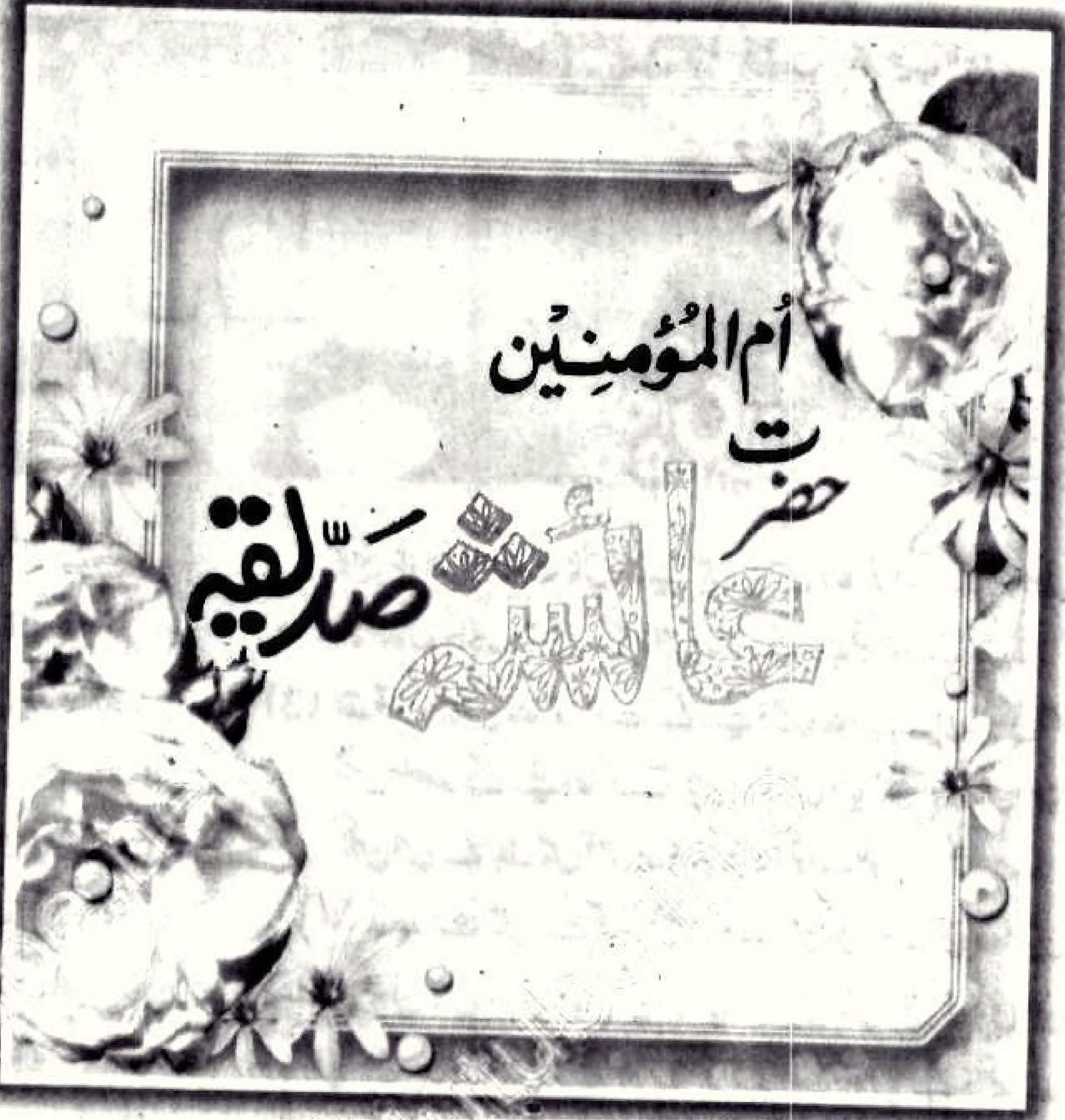
کھولیں وہ یا نہ کھولیں در، اس پر ہو کیوں تری نظر
تو بس اپنا کام مگر یعنی صدا لگائے جا
کبھی کبھی اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ دعا دیر سے قبول کی جائے اور ہماری بہتری بھی اسی میں ہوتی ہے، لیکن ہم اپنی نادانی کی وجہ سے اس کو نہیں جانتے، اس لیے جلد بازی کرتے ہیں اور مایوس ہو کر دعا چھوڑ دیتے ہیں۔

دعا کے قبول ہونے کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

- (1) ہم جس چیز کی دعا کرتے ہیں وہی چیز مل جاتی ہے۔
- (2) اللہ تعالیٰ ہمیں وہ چیز دینا بہتر نہیں سمجھتے اس لیے وہ تو نہیں ملتی، لیکن اس کے بجائے کوئی اور نعمت دے دیتے ہیں یا کوئی آنے

”عورتوں پر عائشہ کی فضیلت ایسی ہے جیسی تمام کھانوں پر شہید کو فضیلت حاصل ہے۔“

حضرت عائشہؓ بہت خدمت گزار تھیں۔ شوہر کی نہایت اطاعت گزار تھیں۔ آپؓ اور حضرت عائشہؓ اکٹھے کھانا کھایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا آنحضرتؐ کی دوسری ازواج سے برتاؤ بہت اچھا تھا۔ حضرت عائشہؓ کی علمی حیثیت کو نہ صرف عام عورتوں پر، نہ صرف اُمہات المؤمنینؓ پر، نہ صرف خاص خاص صحابیوںؓ پر بلکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابہؓ پر فوقیت حاصل تھی۔ آپؓ سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحب علم اور عوام میں سب سے زیادہ اچھی رائے رکھنے والی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہؓ ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ قرآن، فرائض، حلال و حرام، فقہ، شاعری، طب، عرب کی تاریخ اور نسب کا حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر عالم کسی کو نہ دیکھا۔



حضرت عائشہ صدیقہؓ کا لقب صدیقہ تھا، خطاب اُم المؤمنین، کنیت اُم عبداللہ اور لقب حمیرا تھا۔ آپؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحب زادی تھیں۔ والدہ کا نام اُم رمان تھا۔ رسول اکرمؐ کی پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ تھیں۔ ان کی رحلت کے بعد آپؓ کی شادی حضرت عائشہؓ سے ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کا نکاح، مہر، رخصتی غرض ہر رسم سادگی سے ادا کی گئی جس میں تکلف، آرائش اور اسراف کا نام تک نہیں تھا۔ آپؓ کے نکاح کی تقریب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے ذریعے عرب کی بہت سی بے ہودہ اور لغو رسموں کی بندشیں ٹوٹیں۔ سب سے پہلے یہ کہ عرب منہ بولے بھائی کی لڑکی سے شادی نہیں کرتے تھے، دوسری رسم یہ تھی کہ اہل عرب شوال میں شادی نہیں کرتے تھے۔ عرب ماہ شوال کو منحوس سمجھتے تھے۔ عرب میں قدیم دستور تھا کہ دہن کے آگے آگے آگے جلاتے تھے۔ ان تمام رسمیات کا خاتمہ بھی ہوا۔

حضرت عائشہؓ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھیں جن کے کانوں نے کبھی کفر و شرک کی آوازیں نہیں سنیں۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے اپنے والدین کو پہچانا، ان کو مسلمان پایا۔ آنحضرتؐ کو حضرت عائشہؓ سے نہایت محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ کی فضیلت کے بارے میں آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے:

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے بچپن سے جوانی تک کا زمانہ اس ذات اقدسؐ کی صحبت میں بسر کیا، جو دنیا میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے آئے تھے اور جس کی روئے جمال کا غارہ انگ لعلی خلقی عظیم ہے۔ اس تربیت گاہ روحانی یعنی کاشانہ نبوت نے پروگیان حرم کو حسن اخلاق کے اس رتبہ تک پہنچا دیا تھا، جو انسانیت کی روحانی ترقی کی آخری منزل ہے۔

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا اخلاق نہایت بلند تھا، وہ نہایت سنجیدہ، فیاض، قانع، عبادت گزار اور رحم دل تھیں۔

انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی عسرت اور فقر و فاقہ سے بسر کی لیکن وہ کبھی شکایت کا کوئی حرف زبان پر نہیں لائیں۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ایک دفعہ انہوں نے کھانا طلب کیا، پھر فرمایا میں کبھی سیر ہو کر نہیں کھاتی کہ مجھے رونا نہ آتا ہو، ان کے ایک شاگرد نے پوچھا: یہ کیوں؟ فرمایا، مجھے وہ حالت یاد آتی ہے جس میں آنحضرتؐ نے دنیا کو چھوڑا، خدا کی قسم دن میں دو دفعہ کبھی سیر نہ کرتے تھے۔ روٹی اور گوشت نہیں کھایا۔ (ترمذی، زہد)

رسول اللہؐ کی اطاعت و فرمانبرداری اور آپؐ کی مسرت و رضا کے حصول میں شب و روز کوشاں رہتیں، وہ کبھی کسی کی بُرائی نہیں

کرتی تھیں۔ سوکنوں کو بُرا کہنا عورتوں کی خصوصیت ہے مگر وہ کشادہ پیشانی سے اپنی سوکنوں کی خوبیوں کو بیان اور ان کے فضائل و مناقب کا ذکر کرتی ہیں۔

کسی کا احسان کم قبول کرتی تھیں اور کرتی بھی تھیں تو اس کا معاوضہ ضرور ادا کرتی تھیں۔ فتوحات عراق کے مالِ غنیمت میں موتیوں کی ایک ڈبیہ آئی۔ عام مسلمانوں کی اجازت سے حضرت عمرؓ نے وہ حضرت عائشہؓ کو نذر بھیجی۔ حضرت عائشہؓ نے ڈبیہ کھول کر کہا: ”خدایا! مجھے ابنِ خطاب کا احسان اٹھانے کے لیے اب زندہ نہ رکھ۔“ اطراف ملک سے ان کے پاس ہدیے اور تحفے آیا کرتے تھے، حکم تھا کہ ہر تحفے کا معاوضہ ضرور بھیجا جائے۔ عبداللہ بن عامر عرب کے ایک رئیس نے کچھ روپے اور کپڑے بھیجے۔ ان کو یہ کہہ کر واپس کر دینا چاہا کہ ہم کسی کی کوئی چیز قبول نہیں کرتے لیکن پھر آپ کا ایک فرمان یاد آ گیا تو واپس لے لیا۔

اپنے منہ سے اپنی تعریف پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس عجوبہ و خاکساری کے باوجود وہ خود دلا بھی تھیں۔ حضرت صدیقہ کمال خودداری کے ساتھ انصاف پسند بھی تھیں۔

نہایت شجاع اور بُردل تھیں۔ میدانِ جنگ میں آ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ غزوہٴ احد میں جب مسلمانوں میں اضطراب برپا تھا، اپنی پیٹھ پر مشک لاد لاد کر زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ غزوہٴ خندق میں جب چاروں طرف سے مشرکینِ عاصرہ کیے ہوئے تھے اور شہر کے اندر یہودیوں کے حملے کا خوف تھا، وہ بہ خطر قلعہ سے نکل کر مسلمانوں کا نقشہٴ جنگ کا معائنہ کرتی تھیں۔ آنحضرتؐ سے لڑائیوں میں بھی شرکت کی اجازت چاہی تھی لیکن نہ ملی۔ جنگِ جمل میں وہ جس شان سے فوجوں کو لائیں، وہ بھی ان کی طبعی شجاعت کا ثبوت ہے۔

حضرت عائشہؓ کے اخلاق کا سب سے ممتاز جوہر ان کی طبعی فیاضی اور کشادہ دہی تھی۔ دونوں بہنیں حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ، نہایت کریم النفس اور فیاض تھیں۔ حضرت عبداللہ ابنِ زبیرؓ کہتے ہیں کہ ان دونوں سے زیادہ سخی اور صاحبِ کرم میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ فرق یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ ذرا ذرا جوڑ کر جمع کرتی تھیں۔ جب کچھ رقم اکٹھی ہو جاتی تھی، بانٹ دیتی تھیں اور حضرت اسماءؓ کا یہ حال تھا کہ جو کچھ پاتی تھیں، اس کو اٹھا نہیں رکھتی تھیں، اکثر مقروض رہتی تھیں اور ادھر ادھر سے قرض لیا کرتی تھیں۔ لوگ

عرض کرنے لگے کہ آپ کو قرض کی کیا ضرورت ہے، فرماتیں کہ جس کی قرض ادا کرنے کی نیت ہوتی ہے، خدا اس کی اعانت فرماتا ہے، میں اس کی اسی اعانت کو ڈھونڈتی ہوں۔

خیرات میں تھوڑے بہت کا لحاظ نہ کرتیں، جو موجود ہوتا سائل کی نذر کر دیتیں۔ ایک دفعہ روزے سے تھیں، گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اتنے میں ایک سائل نے آواز دی۔ لونڈی کو حکم دیا کہ وہ ایک روٹی بھی اس کی نذر کر دو۔ عرض کی کہ شام کو افطار کس چیز سے کھجے گا۔ فرمایا، یہ تو دے دو، شام ہوئی تو کسی نے بکری کا سالن ہدیہ بھیجا، لونڈی سے کہا دیکھو یہ تمہاری روٹی سے بہتر چیز خدا نے بھیج دی۔ اپنے رہنے کا مکان امیر معاویہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، قیمت جو آئی وہ سب راہِ خدا میں صرف کر دی۔

دل میں خوف اور خشیتِ الہی تھی۔ رقیق القلب بھی بہت تھیں، بہت جلد رونے لگتیں تھیں۔ عبادتِ الہی میں اکثر مصروف رہتیں، چاشت کی نماز پڑھا کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ اگر میرا باپ بھی قبر سے اٹھ کر آئے اور مجھ کو منع کرے تو میں باز نہ آؤں۔ آنحضرتؐ کے ساتھ راتوں کو اٹھ کر نماز تہجد ادا کرتی تھیں۔ آپؐ کی وفات کے بعد بھی اس قدر پابند تھیں کہ اگر اتفاق سے آنکھ لگ جاتی اور وقت پر اٹھ سکتیں تو سویرے اٹھ کر نمازِ فجر سے پہلے تہجد ادا کر لیتیں۔ ایک دفعہ اسی موقع پر ان کے بھتیجے قاسم پہنچ گئے تو انہوں نے دریافت کیا کہ پھوپھی جان یہ کیسی نماز ہے؟ فرمایا، میں رات کو نہیں پڑھ سکی اور اب اس کو چھوڑ نہیں سکتیں ہوں۔ رمضان میں تراویح کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ ذکوان نام کا ایک خواندہ غلام تھا جو امام ہوتا تھا۔ سامنے قرآن رکھ کر پڑھتا تھا، یہ مقتدی ہوتیں۔

اکثر روزے رکھا کرتی تھیں اور بعض روایتوں میں ہے کہ ہمیشہ روزے سے رہتی تھیں۔ ایک دفعہ گرمی کے دنوں میں عرفہ کے روز روزے سے تھیں۔ گرمی اور تپش اس قدر شدید تھی کہ سر پر پانی کے چھینٹے دیئے جاتے تھے۔ عبدالرحمنؓ آپ کے بھائی نے کہا کہ اس گرمی میں روزہ ضروری نہیں، افطار کر لیجئے۔ فرمایا کہ جب میں آنحضرتؐ کی زبانی یہ سن چکی ہوں کہ عرفہ کے دن روزہ رکھنا سال کے گناہ معاف کر دیتا ہے تو میں روزہ توڑوں گی؟

(بقیہ صفحہ 59 پر ملاحظہ کریں۔)



ایک اندرا ایک نوالہ

آج ہفتے کا دن تھا، لہذا اس کے بیٹے سلمان کو اسکول سے چھٹی تھی۔ اس لیے اس کا ارادہ دیر تک سونے کا تھا مگر رات اسے ہتا چلا کہ اس کا بھائی ثانی فائیڈ بخار کا شکار ہو گیا ہے، اس لیے اسے دیکھنے جانا ضروری تھا۔ ان دونوں میں وہ عدنان کو دیکھ کر آسکتا تھا۔ عدنان اپنی والدہ کے ساتھ نصرپور، اپنے آبائی گھر میں رہتا تھا۔ اس کے علاقے سے اپنے گھر کا سترتین گھنٹے کا تھا، اس لیے اس نے سویرے سویرے ہی نکل جانا مناسب سمجھا کہ بعد میں گرمی کو کون جھیلے گا۔

بس دو گھنٹے بعد ایک بڑے اسٹاپ پر ٹھہری تو مسافروں کو بتایا گیا کہ ایک ٹائر میں چوڑی خرابی ہے اس لیے اسے تبدیل کرنا پڑے گا۔ بس ویسے بھی اس اسٹاپ پر بیس منٹ کا وقفہ کرتی تھی تاکہ پُرانے مسافر اتر جائیں اور آگے کی منزل کی طرف جانے والے اس میں شریک ہو جائیں۔

مسافروں کو ایک گھنٹے کے بعد بس میں سوار ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔ نعمان نے سوچا کہ کیوں نہ شہر کے اندر تھوڑا سا گھوم پھر لیا جائے۔ بس دس بجے سے پہلے روانہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بسم اللہ پڑھ کر شہر کی اندرونی جانب بڑھ

گرمی کا موسم اپنی شدت پر تھا۔ وہ لوگ تو مزے میں سو رہے تھے جن کے پاس جزیئر یا یو پی ایس تھے لیکن معمولی روزی کمانے والے مزدور پیشہ لوگوں کے پاس ایسی سہولیات کہاں.....؟ ان مزدور طبقے کا معمول یہ ہوتا ہے کہ وہ شدید گرمی میں اپنے بند کمروں سے نکل کر گھروں کی چھتوں پر جا کر سو جاتے ہیں اور ہوا کے جھونکوں کے منتظر رہتے ہیں اور مزدوری کے لیے صبح سویرے ہی نکل جاتے ہیں۔

نعمان کا روزگار تو بہتر نہ تھا، پھر بھی اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنے بیٹے کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ نعمان لوہے کی بنی ریڑھی پر لوگوں کا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا، باپ کی طرح مزدوری نہ کرے بلکہ کوئی اچھا پیشہ اپنا کر یا اچھی ملازمت حاصل کر کے اپنا مستقبل سنوار سکے۔ وہ روز سویرے اٹھ کر اپنے لاڈلے کو اسکول چھوڑنے جاتا تھا۔ اس کا کام تو بازار کھلنے کے وقت یعنی کوئی دوپہر بارہ بجے شروع ہوتا تھا لیکن اپنے بیٹے کی خاطر وہ سویرے اٹھ بھی جاتا اور اسے اسکول چھوڑ کر کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔

گیا۔ بڑے شہروں کی نسبت چھوٹے شہروں بازار کی چہل پہل پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں بازار کھلنا شروع ہو چکے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ایک ہمارا شہر ہے کہ بارہ بجے بھی دکان دار ہر مرکز آنکھیں ملتے ہوئے دکان کی طرف آرہے ہوتے ہیں اور راتوں کو تو ان کا دل ہی نہیں چاہتا کہ گھر کی جانب واپس ہو جائیں۔ وہ ارد گرد کسی ہوٹل کی تلاش میں تھا تاکہ ناشتا کر لے۔ سویرے تو وہ صرف چائے پی کر ہی چل دیا تھا۔

ابھی وہ اس سوچ میں ہی تھا کہ کس طرف جا کر ہوٹل تلاش کرنے کہ ایک دیہاتی نے اس کی جانب بڑھ کر اس سے سلام دعا کر لی۔ ”لگتا ہے اس شہر میں نئے ہو؟“

”جی! اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ فوراً پوچھ بیٹھا۔

”انڈا اور پراٹھا کھاؤ گے۔“

نیکی اور پوچھ پوچھ۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، اس لیے کچھ تذبذب کے بعد وہ اس دیہاتی کے ساتھ چل دیا۔ وہ اسے بازار کے ایک طرف سے نکال کر ایک سادہ سی سڑک کی طرف لے کر چلا۔ یہ راستہ شاید آبادی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ وہ شخص اسے کسی ہوٹل میں لے کر جائے گا لیکن وہ تو اسے لے کر شاید اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اس نے خواہ مخواہ سوالات میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کے ساتھ چلنے کو زیادہ اہمیت دی۔ وہ تو انڈے اور پراٹھے کا دل دادہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ایسے مکان کے سامنے کھڑے تھے جس کے دروازے پر ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ کوئی پچاس ساٹھ افراد اس لائن میں کھڑے کسی چیز کے لیے مچل رہے تھے۔ اس شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس قطار کی جانب بڑھا اور اسے بھی اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

”ارے بابا! سب سمجھ جاؤ گے۔“ اس کے بعد اس نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور قطار میں آگے بڑھتا رہا۔

منٹ کے اندر اندر ان کا نمبر بھی آ گیا۔ اس کا ہاتھ جب کھڑکی میں گیا تو اندر سے ایک ٹوکن دے دیا گیا۔ اس نے دیکھا تو اس پر ایک انڈا، ایک پراٹھا تحریر تھا۔ ان کے پیچھے بھی خاصی تعداد میں

لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ٹوکن پا کر وہ دوسروں کی طرح خوشی خوشی اندر داخل ہو چکے تھے۔ جب وہ اندرونی طرف پہنچے تو وہاں ایک بڑا مچن تھا جس میں دریاں اور دسترخوان بچھایا ہوا تھا۔ ان سے پہلے اندر آنے والے لوگ اپنے لیے جگہ پسند کر کے بیٹھ چکے تھے۔ ان دونوں نے بھی اپنے لیے جگہ پسند کی اور بیٹھ گئے۔ انہیں کتنا انتظار کرنا ہو گا؟ اس نے سوالیہ نظروں سے جب اس اجنبی ہم درد کی جانب دیکھا تو وہ اس کی پریشانی کو بھانپ کر خود ہی بولا۔

”ہمارے ٹوکن کا نمبر 65 ہے۔ جیسے ہی 101 واں ٹوکن دے دیا جائے گا، کھڑکی بند ہو جائے گی اور تمام لوگوں کے دسترخوان پر بیٹھے ہی ناشتا تقسیم ہونا شروع ہو جائے گا۔“

نعمان کے پاس آدھا گھنٹا باقی تھا، پھر بھی تشویش تو رہتی ہے۔ اس نے اڈے سے چلتے ہوئے اپنی ساتھ والی سیٹ کے ساتھی کو اپنا موبائل نمبر لکھوا کر یہ تاکید کر آیا تھا کہ ٹائر کی تبدیلی کے بعد جیسے ہی بس چلنے کو ہو تو مس کال دے دے اور بس والوں کو بھی بتائے کہ میرا انتظار کریں۔

چند ہی ساعتوں میں ویسا ہی ہوا۔ ہر فرد کے آگے ایک سیلفین کاغذ میں لپٹا انڈا پراٹھا آنا شروع ہو گیا۔ انہوں نے سیکنڈوں میں پورے ایک سو ایک افراد کو خوش بو دار دیسی گھی میں تلا ہوا انڈا، پراٹھا دے دیا اور اب سب کو اشارہ ہوا کہ کھانا شروع کر دیا جائے۔ جوں جوں ان کا ناشتا آگے بڑھ رہا تھا، چائے کے کپ کھنکے اور سب کے آگے ایک ایک کپ بھی رکھ دیا گیا۔ تمام لوگوں نے مزے لے کر انڈا پراٹھا کھایا اور ساتھ میں چائے کی چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ وہ بے حد حیران تھا کہ یہ نہ تو ہوٹل ہے نہ کوئی درگاہ۔ پھر اس قدر اہتمام کیوں؟

جب وہ کھاپی گر باہر نکلے اور میزبانوں نے بجائے ان سے کچھ لینے کے ان کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ بھی آنے کی دعوت دی۔ بیرونی دروازے پر اب اس محفل کا انعقاد کرنے والا فراخ دل انسان بھی موجود تھا جو باہر جانے والے ہر فرد سے خوش دلی سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ وہ بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ آئندہ بھی آکر اس دعوت کو رونق بخشیں۔

وہ دل ہی دل میں بے حد خوش ہوا اور اس سیٹھ کے لیے اس

کے دل سے بھی دعا نکلی۔ آج کے دور میں کوئی کسی کو بغیر مطلب کے کھانا نہیں کھلاتا، یہ شخص روزانہ ایک سو ایک افراد کو خوش دلی سے ناشتا کرا رہا ہے۔ اس نے اپنے اجنبی دوست کو بس کے اڈے تک چلنے کی دعوت دی جو اس نے بخوشی قبول کر لی۔

وہ اس عجیب و غریب دعوت پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت جاننے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ دیہاتی چوں کہ اسی علاقے کا تھا اس لیے اسے کہانی ضرور معلوم ہو گئی۔ اس نے اجنبی سے یہی سوال کیا تو وہ ایسے شروع ہو گیا جیسے خود اس کو بتانے کی فکر میں ہو۔

”بات یہ ہے ادا (بھائی)! ابھی جس رئیس کی انڈے پراٹھے کی دعوت کھا کر ہم آ رہے ہیں، اصل میں اس کے ساتھ بڑا عجیب و غریب واقعہ ہوا تھا جس نے اس کی زندگی یکسر بدل دی اب وہ کئی برسوں سے روزانہ سو سے اوپر افراد کو ناشتا کراتا ہے، پھر اس کے بعد اپنے گھر والوں کے ساتھ جا کر کھاتا ہے۔ ہے ناں یہ اس کی اعلیٰ ظرفی۔“

”کیوں نہیں!“ اتنی اچھی بات کون کر اس نے اس کی تائید کی۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنی بات شروع کی۔ ”ایک وقت ایسا تھا کہ وہ ایک غام سا آدمی تھا، یوں سمجھو ہماری تمہاری طرح کا انسان۔“

یہ کہہ کر اس نے کچھ سانس لی اس کے بعد پھر شروع ہو گیا۔

”معمولی سی ملازمت تھی۔ اس کے گھر کے حالات زیادہ اچھے نہ تھے، پھر بھی یہ خود روزانہ انڈے سے ہی ناشتا کرتا تھا۔ اس کا صرف ایک بیٹا تھا جو اس کے ناشتے کے دوران سامنے آ جاتا تھا۔ رئیس چاہتا تھا کہ وہ خود ہی پورا انڈا کھائے، اس میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔“

”پھر کیا ہوا؟“ اس نے سوال کیا۔

”جب بیٹا اس کی طرف بڑھ جاتا یا اس کے انڈے کی طرف نگاہ کر لیتا تو وہ سخت غصہ ہو جاتا اور کبھی کبھی اس کو ہاتھ بھی جڑ دیتا۔“ اجنبی

نے کہا۔

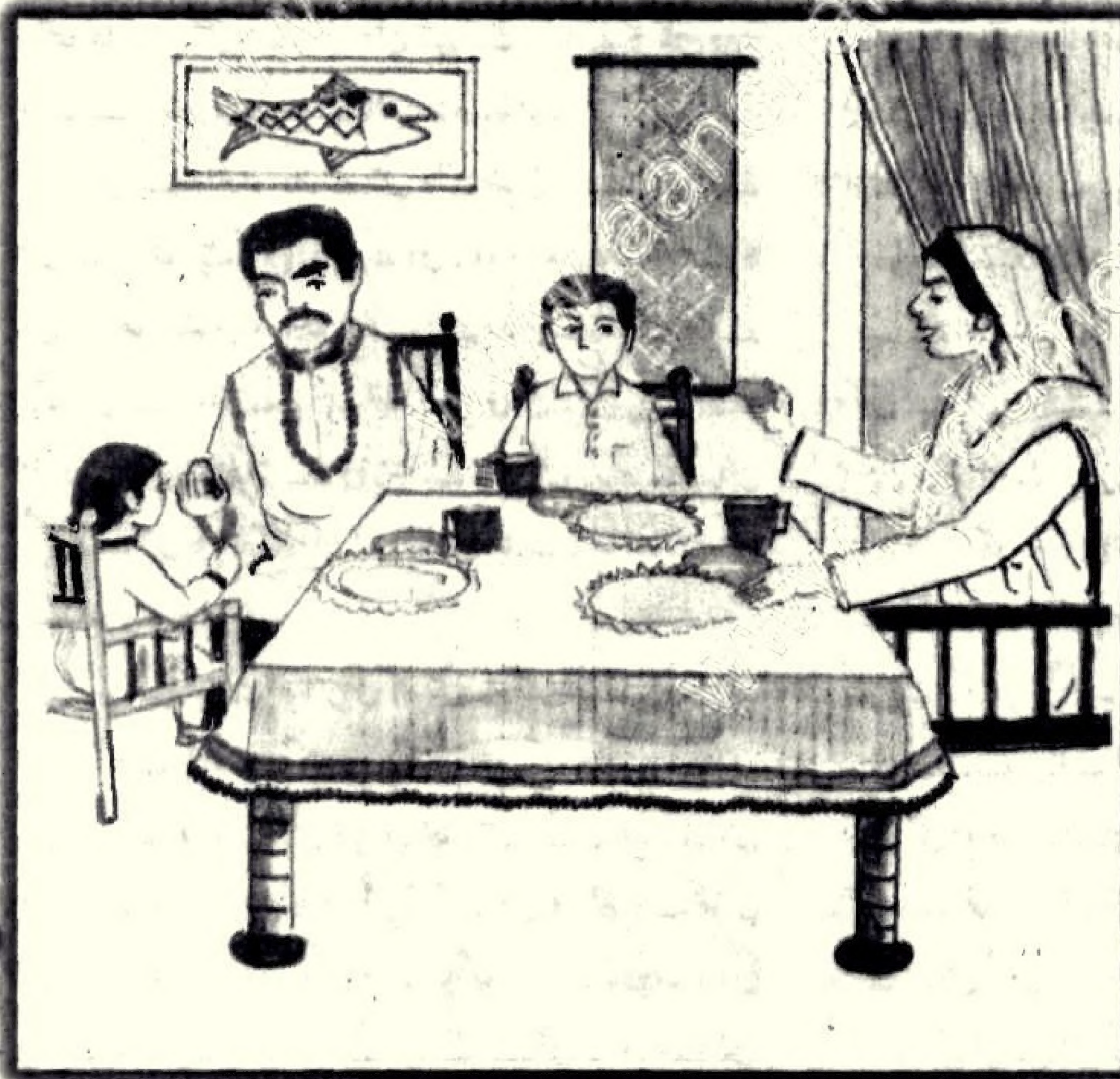
”اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوتا تھا۔“

”بس! غربت انسان کی عقل بھی ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ بعد میں وہ پیٹھ موڑ کر ناشتا کرنے لگتا اور اٹھنے سے پہلے بیٹے کے لیے انڈے اور پراٹھے کا ایک نوالہ چھوڑتا۔“ دیہاتی نے کہا۔

”آف! اس کے بیٹے کے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔“ اس نے اداسی سے سوچا اور اچانک ہی اس کے ذہن میں کچھ خیالات کوندنے لگے۔

”پھر یہ ہوا کہ اس کی بھیلی کی اسے سزا ملی۔ اس کا یہی اکلوتا بیٹا باپ کی باتیں سوچ سوچ کر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گیا۔ بھیلی بھیلی باتیں کرتے کرتے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اب کہاں کے انڈے اور کہاں کے پراٹھے۔ بیٹے کی بیماری نے اس کو سب کچھ بھلا دیا۔ وہ اس کے علاج کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔ پریشانی تھی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔“

”اوہ!“ اس نے افسردگی سے کہا۔ اس عرصے میں وہ بس اڈے کی طرف پہنچ چکے تھے۔ ٹائر لگا دیا گیا تھا اور مسافر بس میں



بہت سیاری کیا اور پھر فوری دسترخوان لگوا کر سب کو بٹھا لیا۔ اپنی

بی بی کے منہ میں جب اس نے اپنے ہاتھوں سے نوالے ڈالے تو اس کی خوشی دیکھ کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔ اسے اُمید ہو چلی تھی کہ اس کا مہربان رب اپنے گھر والوں سے حسن سلوک کے صلے میں اس پر ضرور مہربان ہوگا۔ ☆☆☆

جوگی

جوگی بابا بین بجائے
سانپوں کا اک جوڑا لائے
کانوں میں اک بالہ پہنے
کوچہ کوچہ آئے جائے
بین کی میٹھی میٹھی دھن
سانپوں کی اڑی دشمن
جوگی کھیل تماشے کر کے
پیسے مانگے ہر آہنگن
بچے گھر سے بھاگے آئیں
پیسے لائیں لائیں
جوگی آیا جوگی آیا
کہتے کہتے شوز چائیں
جوگی کا ہے نیارا دھن
اک ٹانگ اور اک ٹانگ
دولوں لپٹے لپٹے چائیں
بچوں کا بہلائیں من
بھوکا جوگی کھانا کھائے
بچے بھائے پانی لائے
مکھنیر آپ تماشا کر کے
دودھ پیتے اور پھن لہرائے
محنت کر کے روٹی کھاؤ
نہ بھاء نہ کوئی تاد
اپنے من کی روٹی دے کر
کیا کرو اچھا برتاد
جیسے اللہ جوگی پالے
جو جی برکھی سوکھی کھا لے
ناگوں کو جھولی میں رکھ کر
نعرے مارے اللہ والے

(احمد عدنان طارق)

سوار ہو رہے تھے۔

”ایک بزرگ نے جب ریش کو پریشانی میں دیکھا تو یہ مشورہ دیا کہ تم صدقہ دو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری ہر مشکل آسان کرے گا۔“ ریش کی سمجھ میں یہ سب کچھ آئی تھی اس نے صدقے کو معمول بنایا اور اپنی پسند کی چیز لٹکی اٹھا اور پرائیٹ بنواتا اور غریبوں کو کھلا کر آتا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کا پینا معمول پر آنا شروع ہو گیا۔ اب وہ بیٹے کو پہلے کھلاتا، بعد میں خود کھاتا۔“

”واہ! یہ بزرگت کلام تھا۔“ اس کے ذہن میں ایک خیال آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔
”اس صدقے کی بابت اللہ نے اس کے کام میں ایسی برکت دی کہ اس کے پاس کوئی دولت بربت نہ کی۔ اس کے پاس ایک بچہ رہتا تھا، اس سے فصل اُگنے لگی۔ دو راتوں رات امیر ہو گیا۔ شکرانہ گت کے طور پر اب اس کا معمول ہے کہ پہلے ایک سو ایک لوگوں کو روزانہ کھانا کھلاتا ہے پھر خود کھاتا ہے۔“

اپنی کہانی ختم کر کے دیہاتی نے سلام دعا کے بعد اس سے اجازت طلب کی اور روانہ ہو گیا۔ وہ بھی جلدی سے بس میں سوار ہو گیا۔ اب وہ مستقل سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی خیریت دریافت کر کے جلد از جلد گھر جانا چاہتا تھا۔ آج کے ناشتے نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ خود بھی ایک ایسی ہی کوتاہی کا مرتکب ہو رہا تھا جیسی ریش سے سرزد ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ انڈا پرائیٹ کھاتا ہے تو اس کی منہی کوئل اس کے پاس آ بیٹھتی ہے اور وہ اس سے نظریں چرا کر یا ایک آدھ نوالہ کھلا کر اسے ادھر ادھر ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ اپنے بیٹے کے تو پھر بھی وہ تاز اٹھا لیتا ہے لیکن بیٹی کو بالکل بھی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی آگئی۔

”آہ میری کوئل! میری بیٹی پر بھی تو میرا حق ہے۔ اگر مجھے تقدیر نے آزما لیا تو.....“ اس بات کے تصور نے اس کو احساسِ ندامت میں مبتلا کر دیا۔

اپنے بھائی کی خیریت دریافت کر کے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں انڈے، پرائیٹ، حلوہ پوری اور مکھن تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی کوئل کو آواز دی۔ اسے گود میں بٹھایا،

۱۔ بیٹ کیری ۲۔ گولڈن ڈک ۳۔ رنر

10۔ پاکستان کی دستوری کتاب کا رنگ کیا ہے؟

۱۔ سرخ ۲۔ سبز ۳۔ سفید

جوابات علمی آزمائش ستمبر 2015ء

1۔ ایلیا 2۔ عامر بن ربیعہ 3۔ چھ ستارے 4۔ ارشمیدس 5۔ سفید گھر 6۔ 1920ء 7۔ مگرودہ کرتے ہوئے عار کیا تھی 8۔ ایران 9۔ حبشید مہتا 10۔ کلب
اس ماہ بے شمار سناہیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 سناہیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ حلیم اسحاق، جہلم (150 روپے کی کتب)
☆ انیقہ فجر ظفر قریشی، میرپور (100 روپے کی کتب)
☆ ریان وارث، سیال کوٹ (90 روپے کی کتب)

دامغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
علینا اختر، کراچی۔ احمد عبداللہ، ملتان۔ ابدال شفقت، اکوڑہ خٹک۔ خدیجہ شجاعت، لاہور۔ محمد ارحم عمران، ملتان۔ محمد قمر الزماں، ضلیم، مٹھ ٹوانہ۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ حارث نعیم، لاہور۔ مامون شفقت، اکوڑہ خٹک۔ محمد طیب طاہر، چٹوکی۔ مطیع الرحمن، ٹھٹھ، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ سلطان سرفراز، ملتان۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ ناعمہ خالد، لاہور۔ تحریم یونس، بہاول نگر۔ طلحہ محمود، لاہور۔ مائرہ اشرف، جوکالیاں۔ عدنان سہاد، جھنگ۔ محمد سجاد برکی، پشاور۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ حضرت امین، پشاور۔ شمس جاوید، پھول نگر۔ رامین رضوان، راول پنڈی۔ مایین شاہد، گجرات۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ سارہ خالد ڈگر، عزت سعود، فیصل آباد۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ نجمہ الاحمر، ملک ہلالی۔ محمد عمر نعیم، جھنگ صدر۔ فائزہ شریف، پشاور۔ حبیبہ ناصر، لاہور۔ مہروز محمود، جہلم۔ ایوب، کوٹ چٹھہ۔ مدیحہ خانیوال۔ امتیاز احسن، گوجرانوالہ۔ حاصم غفور، بہاول پور۔ محمد نوید، قصور۔ شجاعت علی، راول پنڈی۔ ذوالفقار حیدر، لاہور۔ محمد الیاس، سبیل، لاہور۔ یسری زینب اختر، کراچی۔ سدرہ حنیف، فیصل آباد۔ حاصم محمود، لاہور۔ طارق محمود، اوکاڑہ۔ نزہت، ڈیرہ اسماعیل خان۔ صابرہ رحمن، مہوش ایوب، لاہور۔ ثوبیہ علی، فیصل آباد۔ تقی حیدر، کراچی۔ محمد طاہر، سرگودھا۔ ثوبیہ عارف، پورے والا۔ نعمان احمد، لاہور۔ فاخرہ خاتون، طاہرہ یعقوب، عمران ایوب، لاہور۔ الیاس احمد، دہاڑی۔ مکرم علی، میرپور۔ سید ذیشان حیدر، دہاڑی۔ امینہ گل، عبدالرافع، وقار نعیم، عبدالوہاب، فضل کریم، صادق آباد۔ ملک توصیف، فیصل آباد۔ محمد ضیاء اللہ، محمد شاہد، مرید کے۔ ثناء طفیل، سیال کوٹ۔ محمد اورنگ زیب، عرفان، لاہور۔ زاہد مظہر، ٹوبہ، شاہ کوٹ۔ کاشف اقبال، سرگودھا۔ مہر النساء، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عبدالباقی، کراچی۔ صالحہ ناز، ملتان۔ زین علی، شاہ کوٹ۔ عدنان فیصل، راول پنڈی۔ شمع نسیم، لاہور۔ کاشف ضیاء، اسلام آباد۔ نعمان جاوید، فیصل آباد۔ ارسلان اسلم، کوہاٹ۔



درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے ہر ایک کو جواب کا انتخاب کریں۔

- 1۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کن الفاظ میں پکارا جاتا ہے؟
۱۔ ترجمان القرآن ۲۔ رفیق الفار ۳۔ سید المسلمین
- 2۔ کس مسجد میں حضور اکرم ﷺ کو قبلہ تبدیل کرنے کا حکم ہوا؟
۱۔ مسجد نبویؐ ۲۔ مسجد ذوالنہین ۳۔ مسجد قباء
- 3۔ ”مردوں کا شہر“ پاکستان کے کس شہر کو کہا جاتا ہے؟
۱۔ ٹھٹھ ۲۔ ٹیکسلا ۳۔ موہن جودڑو
- 4۔ یہ شہر بانگ درا سے لیا گیا ہے، دوسرا مصرع بتائیے:
کوئی قابل ہو تو ہم شان کی دیتے ہیں
- 5۔ سول سیکرٹریٹ پر مسلم لیگ کا جھنڈا پہلی مرتبہ کس خاتون نے لہرایا؟
۱۔ شائستہ اکرام اللہ ۲۔ رعنا لیاقت علی ۳۔ فاطمہ مغری
- 6۔ برطانوی پولیس کو کیا کہتے ہیں؟
۱۔ رائل پولیس ۲۔ پولیس آف برطانیہ ۳۔ بولی
- 7۔ ”علم دار“ کن کا لقب ہے؟
۱۔ حضرت حسینؑ ۲۔ حضرت عباسؑ ۳۔ حضرت علیؑ
- 8۔ کس شخصیت کو قائد اعظم کا نگریں کا ”شو بوائے“ کہا کرتے تھے؟
۱۔ گاندھی ۲۔ ابوالکلام آزاد ۳۔ نہرو
- 9۔ کرکٹ کی اصطلاح میں جو کھلاڑی پہلی گیند پر آؤٹ ہو جائے کیا کہلاتا ہے؟

بیکہ لاش

سبز پہاڑ کا جوگی

واقعات سنائے۔ اتنے میں امجد کا دوست ٹوگو بھی آ گیا۔ وہ کل سے اپنے اسکول کے ڈرامے کی ریہرسل کے سلسلے میں کسی کلاس فیلو کے ہاں گیا ہوا تھا۔ کھانے کا وقت ہوا تو امجد انہیں قریب کے ایک ہوٹل میں لے گیا اور چاروں نے کھانا کھایا۔ اسی دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ عامر نے امجد سے تہ خانے کے خفیہ حصے اور اس کے اندر تابوت کے متعلق پوچھا تو امجد نے لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا۔

”ٹوگو، کبھی تمہیں اس تہ خانے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟“
عمار نے پوچھا۔ ٹوگو نے انکار کرتے ہوئے کہا: ”ممکن ہے یہ تہ خانہ پہلے مالک مکان نے اپنے بزرگوں کے مردے محفوظ رکھنے کے لیے بنایا ہو۔“ عامر نے اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا مگر عمار نے ٹوگو سے پوچھا: ”آگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا واقعی یہ زومبی کا کام ہے؟“

”کہتے تو یہی ہیں۔ اب کیا معلوم۔“ ٹوگو نے جواب دیا اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ گھر واپس آئے تو ٹوگو نے یکا یک کچھ یاد کر کے کہا: ”کیا تمہیں جادو پر یقین ہے، عامر؟“

”کیا مطلب؟“ ”یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک سبز پہاڑی ہے۔ وہاں ایک غار میں ایک جوگی رہتا ہے۔ وہ غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ چاہو تو آگ کے بارے میں اس سے پوچھ لو۔“

وہ قدموں کے نشانات کے ساتھ ساتھ چلتے کافی دور نکل گئے۔ آخر پراسرار نشان ایک گدلے جوہڑ کے کنارے پہنچ کر غائب ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

واپس جاتے ہوئے عامر کہنے لگا: ”خدا جانے وہ رات کو کس ارادے سے آیا تھا؟“ ”دوبارہ جنگل میں آگ لگانا چاہتا ہوگا، مگر بارش کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔“ عمار نے کہا۔ انہوں نے بنگلے کے صدر دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے کے عین وسط میں کوئی چیز پڑی دکھائی دی۔ یہ پتھر میں لپٹا ہوا ایک کاغذ تھا۔ اس میں لکھا تھا: ”زیدی بھائیو! اب بھی مان جاؤ۔ یہ آخری تنبیہ ہے۔“
یہ رقعہ بھی عامر نے جیب میں رکھ لیا۔ عمار کہنے لگا: ”جب ہم جنگل کی طرف گئے تھے تو یہ رقعہ اس جگہ موجود نہ تھا۔“

واپس آ کر عامر نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ انسپکٹر نے اسے بتایا کہ رات اس نے پولیس کی ایک بڑی نفری لے کر ہوٹل پر چھاپا مارا لیکن کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سب کمرے خالی پڑے تھے۔ پولارڈ کہنے لگا کہ وہ لڑکے جان بوجھ کر پولیس کو تنگ کرنا چاہتے ہوں گے۔ ”انہوں نے ہمیں ولیم کے گھر پابند کر کے چوری کے سامان کو ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔“ عمار نے کہا۔ کافی دیر بارش نہ تھی تو وہ مزید انتظار کیے بغیر امجد کے پاس گئے اور اسے رات کے سارے

اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور امجد سے بولا: ”اچھا، میں چلتا ہوں۔
مجھے سہ پہر کو پھر ریہرسل کے لیے جانا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی عامر اور عمار بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ عامر بولا: ”ٹھیک ہے، جوگی سے بھی مل لیتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔“

کار میں بیٹھتے ہی عمار نے عامر کے کندھے پر جھک کر کہا: ”میرا خیال ہے ٹوگوٹہ خانے کے متعلق جانتا ہے۔“

”خبر نہیں مجھے یہ لڑکا کچھ مانوس سا کیوں لگتا ہے، حالاں کہ ہماری اس سے یہ پہلی ملاقات ہے۔“ عامر نے خیال ظاہر کیا۔

وہ دونوں اسی وقت سبز پہاڑی کی طرف روانہ ہوئے، اور کوئی آدھ گھنٹے بعد پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ انہوں نے کار کو

درختوں کے جھنڈ میں پارک کیا اور غار کی تلاش میں پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ عمار نے ایک درخت پر چڑھ کر دیکھا تو اسے غار کے باہر ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ دونوں اسی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ گھنے جھاڑ

جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ وہ خاردار جھاڑیوں میں الجھتے، گرتے پڑتے، پہاڑی پر چڑھ رہے تھے کہ یکایک اوپر سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔

ایک بہت بڑا چٹان کا ٹکڑا اوپر سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ وہ بڑی

پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئے اور پھر ان کے درمیان سے گزر کر نیچے زمین پر جا گرا۔

”میرا خیال ہے یہ پتھر ہم پر ہی جوگی نے پھینکا ہے۔“ عمار نے کہا۔

آخر کار وہ چٹان کے اوپر پہنچ ہی گئے۔ جوگی ان کی طرف پشت کیے

بیٹھا تھا۔ آہٹ پا کر بھی متوجہ نہ ہوا اور جب لڑکے اس کے سامنے گئے تو

وہ غضب ناک نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر چلایا: ”کون ہو تم؟“

کیوں آئے ہو؟ جاؤ! واپس جاؤ!“ اور پھر اٹھ کر غار میں چلا گیا۔ لڑکے بھی

اس کے پیچھے پیچھے غار میں چلے گئے۔

”بابا، ہم آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“ عامر نے ادب سے کہا۔

”میں تم دنیا والوں سے بھاگ کر یہاں آچھپا ہوں اور تم مجھے یہاں بھی چین سے رہنے نہیں دیتے۔ کیا پوچھتے ہو؟ پوچھو!“

”ہم جنگل کی آگ کے متعلق جانتا چاہتے ہیں۔“ عمار نے کہا۔

”اچھا، تو آؤ میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر وہ غار سے نکلا اور ایک طرف کوچل پڑا۔ ایک جگہ پہاڑوں کے درمیان چھپی ہوئی گہری

کھائی تھی۔ اس کے کنارے پر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں سے بچ کر جوں ہی عمار آگے بڑھا، اس کا پاؤں رپٹ گیا۔ اگر

عامر نے جھپٹ کر اس کی جیکٹ نہ پکڑ لی ہوتی تو وہ کئی فٹ گہرے کھڈ میں جا گرتا۔ جوگی انہیں لے کر ایک پہاڑی پر کھڑا ہو گیا اور

ڈھلان پر پھیلے ہوئے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ”یہ دیکھو! جنگل کی آگ کا نظارہ!“

اس کے اشارے پر لڑکوں نے جلی ہوئی جھاڑیوں اور جھلے ہوئے درختوں کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو شاید بجلی گرنے سے آگ لگی

ہوگی۔ ہم اس کے متعلق نہیں، اس آگ کے بارے میں جانتا چاہتے ہیں جو سید صاحب کے بچکے کے پیچھے والے جنگل میں لگی تھی۔“

”یہ میں واپس چل کر بتاؤں گا۔“ یہ کہہ کر جوگی واپس مڑا۔ راستے میں پھر اس نے عامر کو ایک تختے پر سے گرانے کی کوشش کی



جو دو چٹانوں کے درمیان ہل کا کام دیتا تھا مگر وہ معجزانہ طور پر بچ گیا۔ غار میں پہنچ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور جھڑپیری کے پیر چبانے لگا، جیسے اسے کسی کے وہاں موجود ہونے کا احساس ہی نہ ہو۔

”اب بتاؤ، بابا! تم نے کہا تھا، واپس چل کر بتاؤں گا۔“ عمار نے اسے مخاطب کیا۔

”ہاں..... وہ آگ؟ وہ میں نے لگائی تھی!“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔ لڑکے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”تم نے؟ مگر تم تو اس پہاڑی سے اتر کر کبھی آبادی کی طرف نہیں جاتے۔“ عامر نے کہا۔

”میں نے کب کہا کہ میں وہاں گیا تھا۔“ اس نے بدستور پیر چباتے ہوئے کہا۔ ”مہرے ساتھی نے میرے حکم سے لگائی تو سمجھو میں نے ہی لگائی۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”تمہارا ساتھی کون ہے؟“ عمار نے پوچھا۔
”زومی۔“ اس نے عیاری سے ان کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

”اچھا، زومی۔ اس کا نام کیا ہے؟“ عامر نے پوچھا۔
”یہ تو تم اسی سے پوچھنا۔ اگر ہمت ہے تو۔“ جوگی نے پھر اسی لہجے میں کہا۔ لڑکوں کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئے۔
”ہمیں وہ ملے گا کہاں؟“ عامر نے پوچھا۔

”وہاں.....“ اس نے غار کے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک لمحہ لڑکوں کو یوں لگا جیسے کوئی سایہ سا گھنے درختوں میں نظر آیا مگر غور سے دیکھا تو وہ دھوئیں کے مرغولے تھے جو بہت دور امجد کے جنگل کے قریب جنگل سے اٹھ رہا تھا۔

”ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔“ عامر نے کہا، اور دونوں چھلانگیں مارتے ہوئے پہاڑ پر سے اتر کر اپنی کار کی طرف دوڑ پڑے۔

”سب سے پہلے ہمیں فائر بریگیڈ کو فون کرنا چاہیے۔“ عمار نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ عامر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، اور اگلے ہی لمحے گاڑی ہوا کے دوش پر اڑی جا رہی تھی۔ وہ بیس منٹ کے اندر موقع پر پہنچ گئے مگر پولیس نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں اور کسی کو اس علاقے کی طرف جانے کی اجازت نہ تھی مگر جب زیدی بھائیوں نے اپنا تعارف کرایا تو پولیس نے انہیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ جنگل کے چاروں طرف چکر لگاتے ہوئے جنگل کی طرف والے باغیچے میں گئے۔ آگ کافی پھیل چکی تھی، مگر ابھی جنگل سے

خاصی دھڑکی۔ شعلے لپک لپک کر آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک تنادر درخت کا تنا دھڑا دھڑا جل رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ ساتھ والے چھوٹے درختوں پر گرنا اور وہ بھی آگ کی لپیٹ میں آگئے۔

”خدا کی پناہ! میں نے ایسا بھیانک منظر آج تک نہیں دیکھا۔“ عمار پریشان ہو کر کہنے لگا۔

اتنے میں فائر بریگیڈ کے پانچ انجن آچکے تھے اور وہ آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ ٹرکوں پر بڑی بڑی مشینیں رکھی ہوئی تھیں جو آگ بجھانے والی گیس پھینک رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ہل ڈوڑر جلی ہوئی جھاڑیوں کو صاف کرتے جا رہے تھے۔ جنگل کے اندرونی حصے میں جہاں حالت زیادہ خطرناک تھی، ہیلی کاپٹر سے آگ بجھانے والی کیمیائی اشیا چھڑکی جا رہی تھیں۔ عامر اور عمار نے عملے کے انچارج سے خود لے کر سر پر پہنے اور نیچے پکڑ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ گھاس اور جھاڑیاں صاف کرنے لگے۔ عامر کے ساتھ اسی کی عمر کا ایک لڑکا بھی کام میں مصروف تھا۔ عامر نے غور سے اسے دیکھا تو اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ امجد کا دوست ٹوگو تھا۔

”پولیس کا ٹیلی فون آیا تو امجد گھر پر نہیں تھا۔ میں اس کے لیے پیغام چھوڑ کر خود چلا آیا۔“ ٹوگو نے عامر کو بتایا۔ عامر نے اس کی مستعدی کی تعریف کی۔ اتنے میں امجد بھی پہنچ گیا اور ان کے ساتھ کام میں شامل ہو گیا۔ آخر سب کی انتھک محنت اور جاں فشانی کے نتیجے میں آگ بجھ گئی۔

عامر نے فائر بریگیڈ کے انچارج سے پوچھا: ”آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

”یہ کسی نے دانستہ لگائی ہے۔ ہم نے نزدیک کی جھاڑیوں میں ماچس کی کئی تیلیاں پڑی دیکھی ہیں۔ پہلے اس شخص نے مکان کے قریب کی جھاڑیوں میں آگ لگانی چاہی مگر جب سبز شاخوں نے آگ نہ پکڑی تو وہ جنگل کے درمیانی حصے میں کسی خشک جھاڑی کو جلانے میں کام یاب ہو گیا۔“ افسر نے بیان کیا۔

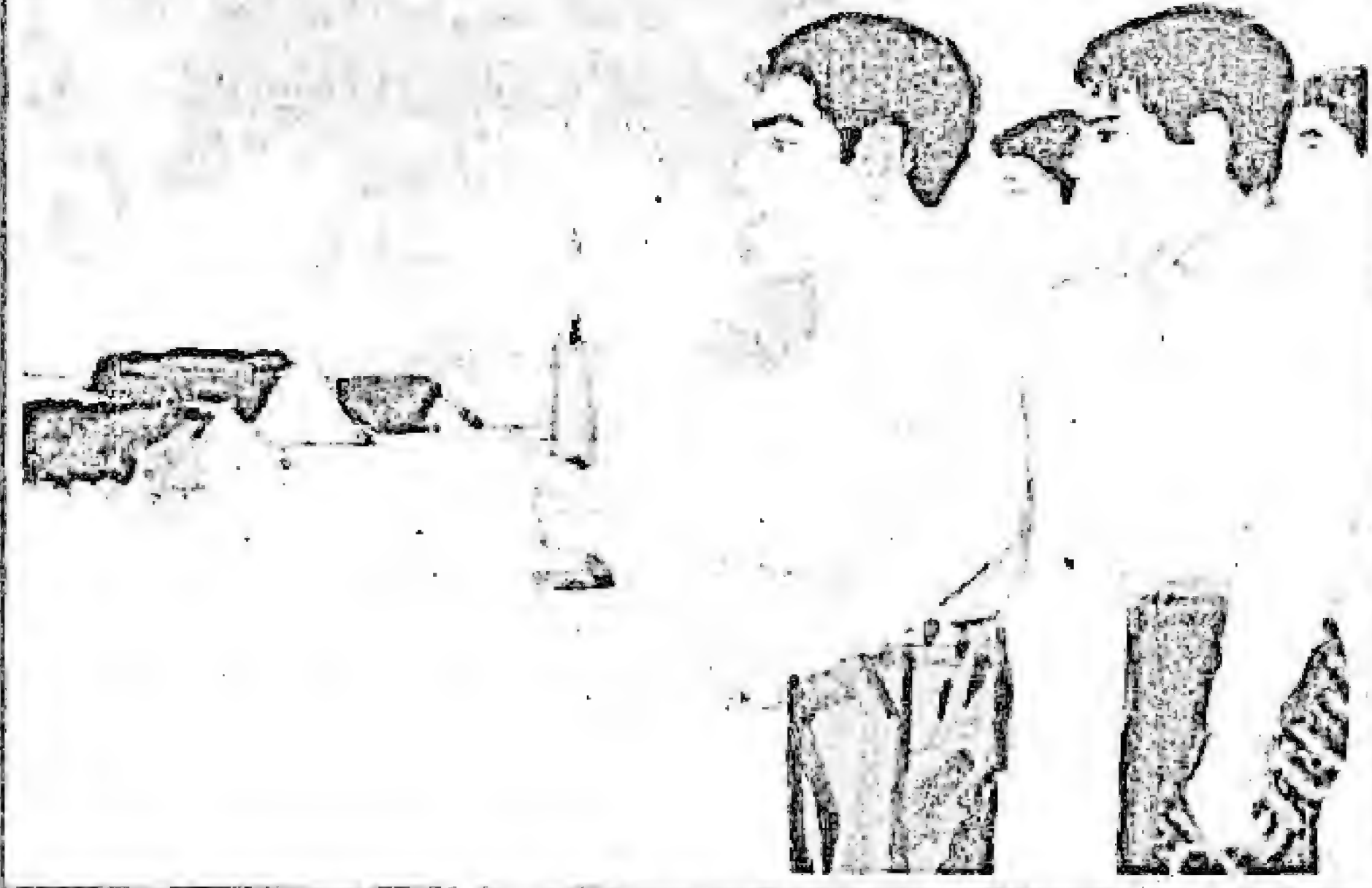
”ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے۔“ عمار نے جوش سے کہا۔
”پکڑا جائے تو ضرور سزا دی جائے گی۔“ افسر نے عمار کو جواب دیا۔
”جب لوگ چلے گئے تو امجد اپنے تینوں دوستوں کو گھر کے اندر لے گیا اور کھانے پینے کا بندوبست کرنے لگا۔ سخت محنت کے بعد ان کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ جو کچھ بھی موجود تھا، خوب سیر ہو کر کھایا

پیا۔ کھانے کے دوران تہ خانے اور تابوت کا ذکر آ گیا۔ فارغ ہو کر چاروں نے موم بتیاں جلائیں اور تہ خانے میں اتر گئے۔

”جب ہم گئے ہیں تو یہاں فیوز کا ڈبا پڑا تھا۔ اب نہیں ہے۔“ نوکر نے کہا۔

”کوئی اٹھا کر لے گیا ہو گا تاکہ ہم اندھیرے میں ٹھوکریں کھائیں۔“ عمار نے کہا۔

چاروں لڑکے ایک قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اس مرتبہ موم بتیاں دو کی بجائے چار تھیں۔ اس لیے روشنی زیادہ تھی۔ ٹوگو سب سے پیچھے تھا۔ عامر نے آگے بڑھ کر خفیہ دروازے کے کنٹرول بٹن دبائے تو ایک بلاک اندر کی طرف کھسک گیا اور وہ اندر داخل ہوئے۔ روشنی میں تابوت بھی پہلے سے زیادہ واضح نظر آیا اور چھت سے لٹکتے ہوئے مٹری کے جالے بھی۔



”کتنی بھیانک جگہ تجویز کی ہے کسی نے اپنا تابوت رکھنے کے لیے۔“ ٹوگو نے اپنے بالوں پر سے جالے جھاڑتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

”لیکن زومی کے لیے ایسی ہی جگہ موزوں ہے۔“ عمار بولا۔

عامر ہاتھ میں موم بتی لیے سامنے کی دیوار کی طرف بڑھا جہاں ایک قطار میں کچھ قبریں تھیں، جو پہلے نظر نہیں آئی تھیں۔ وہ ان کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ اچانک دروازے کے زور سے بند ہونے کی آواز پر چونک اٹھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو خفیہ دروازہ آدھا سرک گیا تھا، مگر بند نہ ہو سکا تھا کیوں کہ آتے ہوئے عامر نے قریب پڑا ہوا ایک پتھر پیر سے سرکا کر اٹکا دیا تھا۔ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے دروازے پر پہنچے تو اس کے دوسری طرف ٹوگو بوکھلایا ہوا سا کھڑا تھا۔

”تم نے بٹن دبایا تھا؟“ عامر نے ٹوگو سے پوچھا۔

”میں نے راستہ دیکھنے کے لیے شمع اوپر اٹھائی تو میرا ہاتھ شاید بٹن سے چھو گیا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں باہر جانا چاہتا تھا۔“ ٹوگو نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”ٹوگو ایسا لڑکا نہیں کہ ہمیں جان بوجھ کر ہراساں کرتا۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ.....“ امجد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عمار بول اٹھا: ”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ مگر شبہ اس کے دل میں

پیدا ہو چکا تھا۔ یہی حال عامر کا تھا مگر اس نے بھی اپنے رویے سے کچھ ظاہر ہونے نہ دیا۔

زومی کے متعلق باتیں کرتے وہ باہر کے تہ خانے میں پہنچے عامر نے خفیہ دروازہ بند کیا اور کہا: ”یہ زومی کی ہر روز کی آمد و رفت کا راستہ ہے۔“

”سنا ہے سرکس میں بھی ایک زومی ہے۔ کوئی آرکن نام کا ہسپانوی زومی کا رول ادا کرتا ہے اور اس چھوٹے سے سہانڈ شو کو لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔“ امجد نے بتایا۔

”تم نے دیکھا ہے؟“ عمار نے پوچھا۔ ”نہیں، کلاس کے لڑکے بتا رہے تھے۔ پروگرام بناؤ تو سب مل کر سرکس دیکھنے چلیں۔“ امجد نے کہا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آرکن ہی فرصت کے وقت سرکس سے نکل آتا ہو اور لوگوں کو دہشت زدہ کرتا ہو؟“ عمار نے پوچھا۔

”نہیں، اس وقت سرکس یہاں نہیں تھا جب سے زومی کو دیکھا جا رہا ہے۔“ عامر نے بھائی کے خیال کی تردید کی۔ ”ممکن ہے اس کا کوئی ساتھی ہو۔“ عمار بولا۔ ”معلوم ہو جائے گا۔“ عامر کہنے لگا۔

”تمہیں سرکس والے کیس میں وہاں جانا تو ہے نا۔“ امجد نے کہا۔

(باقی آئندہ)

چندن ترکھان رو عقل مند چہرہ

دیا۔ صبح سویرے باپ بیٹا سفر پر روانہ ہو گئے۔ سامان پیٹھ پر بٹھائے چلتے چلتے وہ دونوں پہاڑ کے قریب پہنچ گئے۔ اس جگہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے نو چکر لگانے پڑتے تھے۔ اس میں نو موڑ تھے۔ پہلا موڑ عبور کیا تو چندن نے بیٹے سے کہا: ”دڑہ عبور کرنے کا بندوبست کرو۔“ بیٹے نے تھیلے سے دو روٹیاں نکالیں اور دونوں نے ایک ایک روٹی کھائی۔ دوسرے موڑ پر پہنچے تو باپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ بیٹے نے کہا: ”دو ہی روٹیاں تھیلی میں تھیں جو ہم نے کھالی ہیں۔ اب ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“ باپ نے کہا: ”اچھے لے بے فکر کے لیے صرف دو روٹیاں تھیلی میں ڈالی تھیں۔ یہ بے خوف لڑکی میری بہو نہیں بن سکتی۔ چلو واپس چلتے ہیں۔“ واپس گھر پہنچنے پر چندن نے بہو کو طلاق دلوائی اور کسی اور لڑکی کو اپنی بہو بنالیا۔ اس بہو کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ اس نے چندن نے دس لڑکیوں کو بہو بنایا اور یکے بعد دیگرے سب کو طلاق دلواتا گیا۔ اب چندن نے فیصلہ کیا کہ جب تک ایک عقل مند بہو کا بندوبست نہیں ہوتا، اس وقت تک لداخ کا سفر ملتوی رکھا جائے۔ چندن اب عقل مند بہو کی تلاش میں خود نکل کھڑا ہوا۔ دن بھر چلنے کے بعد وہ کسی گاؤں کے کنارے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ عین لڑکیاں اؤکھ دھن رہی تھیں۔ چندن نے لڑکیوں سے پوچھا

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں لداخ کی شکر نامی بیوی نے ایک نہایت ہی عقل مند ترکھان (برہمن) رہتا تھا جو کندہ کاری پر مہارت رکھتا تھا۔ اس کا نام چندن تھا۔ اس کے ایک بیٹے کے سوا اور کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ عموماً تعمیرات کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا اور لڑکی کے گھر کی دیکھ بھال اور بیٹے کی پرورش اس کی بیوی کیا کرتی تھی۔ چندن کا بیٹا جوان ہو گیا تو اس کی ماں مر گئی۔ اب چندن کے لیے گھر سے باہر کام کے لیے نکلنا مشکل ہو گیا۔

بیوی کے مرنے کے بعد گھر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ صرف بیٹا تھا جو کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ ادھر لداخ کے درجہ کی طرف سے پیغام پر پیغام آرہا تھا کہ اس کے محل کی تعمیرات کے لیے چندن جلد از جلد پہنچ جائے۔ چنانچہ چندن نے لداخ روانہ سے پہلے بیٹے کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ایک لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ کچھ روز گزرنے کے بعد چندن نے بہو سے کہا:

”صبح میں اور تمہارا میاں لداخ کے سفر پر جا رہے ہیں، تم ہمارے لیے سامان کی تیاری کر لو۔“ بہو نے ایک تھیلے میں ترکھان کے اوزار اور دوسرے تھیلے میں چند روٹیاں ڈال کر سامان باندھ

کہ میں دُور جگہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں تو بتاؤ کہ میں نے ادھر سے ادھر تک کتنے قدم اٹھائے ہوں گے۔ یہ سن کر لڑکیوں کو سخت غصہ آیا اور کہا: ”ہم تمہارے قدم تھوڑے سگتے رہے ہیں۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بے ہودہ سوال پوچھتا ہے۔“ لیکن تیسری لڑکی نے چندن سے کہا: ”تم ادھر سے یہاں تک ہم پر نظریں جما کر آئے ہو۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارے یہاں پہنچنے تک ہم نے کتنی بار اُون پر ضریریں لگائی ہیں۔“ چندن لڑکی کی بات سن کر اس کی دانائی سے بہت متاثر ہوا اور اس کے گھر جا کر اس کا رشتہ مانگ لیا اور اپنے لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔

شادی کے چند روز بعد چندن نے پھر لداخ جانے کا ارادہ کیا اور بہو کو سامان سفر تیار کرنے کا کہا۔ رات کو بہو نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ تم اپنی ساری بیویوں کو کس در سے طلاق دیتے رہے ہو۔ لڑکے نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ یہ سارا قصہ سننے کے بعد بہو نے کہا: ”جب تمہارا باپ تم سے کہے کہ بیٹا! چڑھائی چڑھنے کا بندوبست کرو تو تم اسے ایک دو موڑ پر روٹی اور خوبانی کا خستہ وغیرہ کھا دینا۔ پھر جب وہ تم سے دوبارہ ایسے ہی کہے کہ تو تم شور مچاتے ہوئے پابڑ کی چوٹی کی طرف دوڑنا کہ چیتا آ گیا ہے۔ باپ بھی یہ سن کر چڑھائی عبور کرے گا اور آئندہ پھر طلاق کی نوبت نہیں آئے گی۔“ دوسری صبح باپ بیٹا پھر سفر پر روانہ ہوئے۔ بیٹے نے پہلے موڑ پر باپ کو روٹی کھلائی اور دوسرے موڑ پر خوبانی کا خستہ کھانے کو دیا۔ تیسرے موڑ پر پہنچتے ہی باپ کے کچھ کہنے سے پہلے بیٹے نے شور مچا کر اوپر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ کل کو موڑ تھے، دو گزر چکے تھے۔ باپ نے وہ شور سن کر دو موڑ دوڑ کر طے کر لیے۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی چیتا نظر نہ آیا۔ بیٹا برابر دوڑے جا رہا تھا۔

باپ نے اسے روکا اور واپس چل پڑا۔ اسے بہو کی شیطانی کا پتا چل گیا تھا۔ لہذا گھر پہنچتے ہی اسے طلاق دلو کر فارغ کر دیا اور کچھ دن بعد دوبارہ ایک عقل مند بہو کی تلاش میں سفر پر نکلا۔ راستے میں ایک شخص ملا جو اسی راستے پر سفر کر رہا تھا۔ چندن اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ شخص جوتے پہن کر چل رہا تھا اور چندن جوتے اتار کر ہاتھ میں لیے ننگے پاؤں جا رہا تھا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد وہ ایک ندی پر پہنچ گئے۔ اب ندی کو عبور کرنا تھا۔ چندن نے جوتے پہن لیے لیکن اس کے ساتھی نے اپنے جوتے اتار دیے اور

اس آدمی نے اپنے جوتے پھر پہن لیے۔ اس شخص نے سوچا کہ چندن پاگل ہے۔ اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ چندن کے پاس دو روٹیاں تھیں۔ دونوں نے بیٹھ کر ایک ایک روٹی کھالی اور پھر چلنے لگے۔ راستہ بھر چندن یہ کہتے ہوئے چلتا رہا: ”ایک روٹی میں نے خود کھالی اور دوسری روٹی پانی میں پھینک دی۔“ اس شخص کو یہ سن کر سخت غصہ آیا کہ میں نے ایک روٹی ہی تو کھائی تھی اور وہ بار بار اسی کو دہرا رہا ہے مگر وہ چندن کو کچھ کہے بغیر چلتا رہا۔ ایک گاؤں میں پہنچے تو ایک جنازہ جا رہا تھا۔ چندن نے اس آدمی سے پوچھا: ”بھئی یہ لاش پرانی ہے کہ نئی؟“ ساتھی کو سخت غصہ آیا اور ہم ہو کر کہا: ”آج کوئی مرا ہو گا جسے یہ دفنانے جا رہے ہیں۔ دُنیا میں کوئی پرانی لاش بھی ہوتی ہے؟“ ساتھی کو یقین ہو چکا تھا کہ چندن پائٹس ہے کیوں کہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔

کچھ دُور ایک مکان کے پاس سے گزرے تو مکان کی چھنی سے دُھواں نکل رہا تھا۔ چندن نے پوچھا: ”یہ دُھواں ٹھنڈا ہے یا گرم؟“ ساتھی نے جل کر کہا: ”دُھواں گرم ہی ہوتا ہے۔“ دونوں چلتے رہے۔ ایک جگہ ایک آدمی کاشت میں مصروف تھا۔ چندن نے پوچھا: ”یہ آدمی کھا کر کاشت کر رہا ہے یا کمانے کے لیے کاشت کر رہا ہے؟“ ساتھی نے مجبوراً جواب دیا: ”فصل کھانے کے لیے ہی کاشت کی جاتی ہے۔“ اتنے میں ساتھی کا گھر قریب آ گیا۔ رات ہو رہی تھی۔ چندن نے کہا: ”میں سامنے والے عبادت خانے میں رات گزاروں گا۔ تم گھر جاؤ لیکن گھر میں داخل ہونے سے پہلے تین بار کھانس لینا۔“ آدمی نے جان چھڑانے کے لیے کھانسا شروع کیا۔ اتفاقاً اس کی بیٹی تین میں نہا رہی تھی۔ آواز سن کر اس نے فوراً کپڑے پہن لیے۔ اتنے میں باپ اندر داخل ہو گیا۔ بیٹی نے باپ کو افسردہ پا کر پوچھا: ”راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“ باپ نے سارا حال کہہ سنایا۔ بیٹی بولی: ”وہ شخص (چندن) پاگل نہیں بلکہ نہایت عقل مند ہے۔ اس کی سازی باتیں حکمت سے بھری ہوئی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس نے پانی میں جوتے پہن لیے۔ خشکی پر ننگے پاؤں چلنے میں کوئی خرچ نہیں ہے کیوں کہ راستے کی ہر چیز نظر آتی ہے لیکن پانی میں چونکہ راستہ صاف نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے کوئی چیز چھپ جائے، آبی مکوڑوں کے کاٹنے اور پھسل کر گرنے کا خدشہ بھی رہتا ہے، اس لیے اس نے

پانی میں جوتے پہن لیے۔ دوسری بات وہ بار بار کہتا رہا: ”میں نے ایک روٹی کھالی اور دوسری پانی میں پھینک دی۔“ اس سے مراد یہ تھی کہ جو روٹی اس نے کھائی وہ صرف پیٹ بھرنے کے کام آئی، گویا وہ بے کار تھی جب کہ جو روٹی آپ نے کھائی وہ اس کے لیے اجر کا باعث بن گئی۔“ یہ سن کر باپ حیران رہ گیا۔ پھر بیٹی نے کہا: ”پرانی لاش کا جو ذکر اس نے کیا اس سے مراد غریب و نادار شخص ہے۔ وہ مہینوں قاتے کرے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس لیے غریب آدمی چلتی پھرتی لاش ہی ہوتا ہے۔ مرنے کے وقت بس دفنانے کی رسم ہی عمل میں آتی ہے حالانکہ وہ ایک پرانی لاش ہوتی ہے جب کہ نئی لاش سے مراد امیر آدمی ہے۔ اسے کاٹا بھی چھبے تو لوگ ٹکانے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ جب وہ مرنے کا لمحہ آتا ہے تو نئی لاش بن جاتا ہے۔“ باپ نے کہا: ”تم غواخواہ اس کی باتوں کی تادیل کرتی ہو۔ اچھا بتاؤ ٹھنڈے اور گرم دھوکے سے کیا مراد ہے۔“ بیٹی نے کہا کہ امیر گھرانوں کے چلوہوں سے جو دھواں نکلتا ہے وہ گرم دھواں ہوتا ہے کیوں کہ اس پر قسم قسم کے کھانے پک رہے ہوتے ہیں جب کہ جو دھواں غریب گھرانوں کے چلوہوں سے نکلتا ہے، وہ ٹھنڈا ہوتا ہے، کیوں کہ چولہے میں صرف تاپنے کے لیے لکڑی جل رہی ہوتی ہے اور ان پر پکنا کچھ نہیں۔“

یہ سن کر باپ بھی اس سے متاثر ہونے لگا۔ پھر بیٹی نے اگلی بات کی وضاحت کی: ”کچھ لوگ کٹا کر کاشت کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کچھ لوگ کفایت شعاری سے کام لینے کے بجائے سب کچھ کھاپی کر ختم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد قرض مانگ کر گزارہ کرتے ہیں اور کاشت کے موسم میں قرض چکانے کے لیے کاشت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اس قرض کے چکر میں ہمیشہ پھنسے رہتے ہیں اور ہمیشہ کٹا کر کاشت کرتے ہیں۔“ اب باپ کو یقین ہو گیا کہ وہ نہایت عقل مند آدمی ہے لیکن اب اسے تین بار کھانس کر گھر میں داخل ہونے کی ہدایت سمجھ نہیں آئی۔

اس نے بیٹی سے اس بات کا مطلب پوچھا تو بیٹی نے کہا: ”میں محض اس خیال سے نہا رہی تھی کہ آپ ابھی نہیں آئیں گے۔ اگر آپ نہ کھانتے تو یونہی بے پردگی کے عالم میں داخل ہو جاتے۔“ اب اسے چندن سے اتنی عقیدت ہو گئی کہ اس نے سیدھا اس کے پاس جا کر اسے اپنے گھر کی روٹیاں دکھائیں۔

لیکن چندن نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس عبادت خانے میں رات گزار کر صبح کو کسی عقل مند بہو کی تلاش میں نکلے گا۔ اب وہ آدمی اپنے گھر گیا اور بیٹی سے کہا کہ وہ گھر تو نہیں آتا اس لیے اس کے لیے کھانا بنا لو کیوں کہ صبح وہ کسی عقل مند بہو کی تلاش میں نکل جائے گا۔ بیٹی نے سوچا کہ مجھے ایسے عقل مند آدمی کی بہو بننا چاہیے۔ پھر اس نے کھانا تیار کیا۔ دو روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ لیں۔ کٹورے میں ترکاری کا شوربہ ڈالا اور گوشت کی تین بوٹیاں بھی ڈال دیں، ساتھ ہی باپ سے کہا کہ اس آدمی سے کہنا، آج تاروں کی تین، چاند کی دو اور موسم ابر آلود ہے۔ باپ کھانا تو لے گیا لیکن راستے میں کھانے میں سے ایک روٹی اور دو بوٹیاں خود کھالیں اور آدھا شوربہ پی لیا۔ اس کے بعد کھانا لے گیا اور بیٹی کی بات چندن کے سامنے دہرا دی۔ چندن نے کھانا کھایا اور برتن دے کر کہا کہ بیٹی سے کہنا کہ آج تاروں کی بھی یکم تاریخ اور چاند کی بھی یکم تاریخ ہے اور موسم صاف ہے۔ اس آدمی نے گھر آ کر چندن کی باتیں بیٹی کو سنائیں تو وہ سمجھ گئی کہ باپ نے ایک روٹی، دو بوٹیاں اور آدھا شوربہ ہڑپ کر لیا ہے۔ اس نے باپ سے پوچھا تو باپ نے تصدیق کر دی۔ چندن اس آدمی کی بیٹی کی بات سے اتنا متاثر ہوا کہ صبح سویرے خود اس کے گھر گیا اور بیٹے کے لیے رشتہ مانگ لیا۔ رشتہ منظور ہوا اور کچھ ہی دنوں میں دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ اب چندن نے لداخ جانے کا ارادہ کیا اور ایک دن بہو سے کہا کہ کل تیرا اور کھانا لداخ روانہ ہو رہے ہیں۔ ہمارے گھر کے لیے خاناں تیار کر دو۔ بہو نے خانوں والا تھیلا بنایا اور ہر خانے کو کھانا رکھ کر ختم اور بارام سے بھر دیا۔ ایک اور تھیلی میں گوشت کے کچے ٹکڑے ڈال دیے۔ دوسرے تھیلے میں بڑھئی کے اوزار ڈالے اور اس طرح سامان تیار کر دیا۔ اس کے بعد شوہر کو بلا کر سمجھایا کہ جب وہ چڑھائی پر پہنچیں اور باپ کہے کہ چڑھائی چڑھنے کا بندوبست کرو تو ہر موڑ پر تھیلی کے ایک خانے کو کھول کر اس میں جو کچھ ہے، باپ کو کھانے کے لیے رکھ دو۔ جب باپ تھیلی کو دودھ کرنے کے لیے لے گا تو یہ گوشت کے ٹکڑے اس کو پیش کرے، اسی طرح چڑھائی ختم ہو جائے گی۔ جب باپ چڑھائی کے آخری مرحلے

میں آرام کرنے بیٹھ جائے تو تم بانسری بجانا۔ یہ کہہ کر اس نے شوہر کے سامان میں ایک بانسری بھی رکھ دی۔ جب دوسری صبح وہ دونوں روانہ ہوئے تو چندن کے بیٹھے نے ایسا ہی کیا۔ دونوں نے خستہ، بادام اور گوشت کھاتے ہوئے درے کو عبور کیا۔

درے کی چوٹی پر جب وہ آرام کرنے کے لیے بیٹھے تو بیٹا اس انداز سے بانسری بجانے لگا کہ چندن کی ساری تھکن اور پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ بانسری کی آواز سن کر لدخ کے راجہ کے سپاہی استقبال کے لیے پہنچ گئے۔ لدخ کے راجہ نے بھی ان کا خیر مقدم کیا۔ اب محل بنانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بادشاہ نے چندن اور اس کے بیٹے کی خدمت کے لیے ایک خدمت گار بھی رکھ دیا۔ چند سالوں میں محل کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا۔ ایسا عالی شان محل ارد گرد کے علاقہ میں کسی کو نصیب نہ تھا۔ محل دن میں سات رنگ بھی اختیار کرتا تھا اور اپنی جگہ سورج کے سامنے سمجھ گھومتا بھی تھا۔ اس کی کندہ کاریاں بھی عجیبہ روزگار تھیں۔ جب بادشاہ محل دیکھنے پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے دربار میں اعلان کر دیا کہ کوئی درباری یہ بتائے کہ چندن کو کتنی دولت دی جانی چاہیے۔ اب کیا تھا، ہر شخص ایک سے بڑھ کر ایک تجویز دینے لگا۔ کسی نے کہا کہ خزانے کا دروازہ کھول کر کہا جائے کہ اپنی مرضی سے جتنا چاہو اٹھا کر لے جاؤ۔ کسی نے کہا کہ دونوں کے وزن کو تول کر پیڑے جواہرات دیے جائیں۔ الغرض اسی طرح ہر ایک نے اپنی تجویز پیش کی۔ جب سب خاموش ہو گئے تو ایک وزیر دست پرست اٹھا اور ادب سے بولا: ”حضور جو بھی انعام عنایت فرمائیں، بس ایک بات مد نظر رکھیں۔ ان دونوں کو روانہ کرنے سے پہلے ان کے ہاتھ پاؤں دیے جائیں تاکہ یہ ایسا عالی شان محل کسی اور راجہ یا حکمران کے لیے نہ بنا سکیں۔“ یہ سن کر سب اس وزیر کو داد دینے لگے۔ راجہ نے بھی ہر دھنا اور ان دونوں کے ہاتھ پاؤں کا حکم دے دیا۔ چندن کے خدمت گار نے یہ سنا تو وہ روتا ہوا چندن کے پاس بھاگا اور اسے ساری بات کہہ ڈالی۔ چندن کو بہت دکھ ہوا مگر اس نے عقل سے کام لیا۔ وہ رات گئے چپکے چپکے محل میں گیا اور محل کی مرکزی چابی نکال لی۔ محل کی عمارت کا توازن بگڑ گیا جس کی وجہ سے محل ٹیڑھا ہو گیا۔ جب صبح کے وقت راجہ کو خبر ہوئی تو اس نے چندن کو بلوا بھیجا۔ چندن آیا تو اس نے اس سے محل کے ٹیڑھے پن کا سبب

پوچھا۔ چندن نے کہا کہ محل کے ٹیڑھے ہونے کی وجہ ایک ہی ہو سکتی ہے کہ راجہ کی نیت ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ راجہ نے اسے بہر صورت محل ٹھیک کرنے کا حکم کیا۔ چندن نے عرض کی: ”عالی جاہ محل کو سیدھا کرنے کا سامان میں گھر بھول آیا ہوں۔ اسے احتیاط سے لانا پڑے گا۔ یہ کام صرف آپ کے وزیر ہی کر سکتے ہیں۔“ راجہ نے اپنے وزیر فوراً بھیج دیے۔ جب وہ جانے لگے تو چندن نے کہا کہ گھر پر میری بہو سے کہنا کہ میں نے محل سیدھا کرنے کا سامان منگوا دیا ہے۔ وزیر گھر پہنچے تو انھوں نے بہو سے یہی کہا۔ بہو سمجھ گئی کہ اس کے سر اور شوہر کسی مشکل میں ہیں۔ اس نے کہا: ”وہ سامان سامنے والے سفیدے کے اندر ہے۔ وہ ٹیک نازک سی چیز ہے۔ اسے احتیاط سے نکالنا پڑے گا۔ میں تنے کو چیر کر اس میں کھوئی لگاتی ہوں تم ہاتھ ڈال کر وہ چیز نکال لینا۔“ جب سب وزیروں نے تنے میں ہاتھ ڈال لیے تو بہو نے تیزی سے کھوئی نکال لی جس سے سب وزیروں کے ہاتھ تنے میں پھنس گئے۔ اب بہو نے اس سے پوچھا کہ اس کا شوہر اور چندن کس مصیبت میں گرفتار ہیں؟ سب نے سچ سچ سارا قصہ بتا دیا۔ بہو نے ان دو وزیروں کی جنھوں نے ہاتھ کاٹنے کی تجویز دی تھی، زبان اور ناک کاٹ ڈالے اور کہا کہ راجہ سے کہو کہ ٹیڑھا پن ٹھیک کرنے کا سامان مل گیا ہے۔ وہ دونوں دربار میں دوبار پہنچ کر اپنی داستان سناتے لگے مگر زبان کٹی ہوئی تھی وجہ سے کبھی کو ان کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ آخر بادشاہ نے کسی طرح سارا معاملہ سمجھ لیا۔ ان کی باتیں سن کر دربار کبھی ہنستا تھا، کبھی روتا تھا۔ اب بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے چندن اور اس کے بیٹے کو مالا مال کر دیا اور عزت و احترام سے روانہ کیا۔ جب دونوں گھر پہنچے تو باقی وزیروں کو آزاد کر دیا۔ اس طرح نہ صرف چندن کی بہو کی دوڑ دھوپ رنگ لائی بلکہ دونوں وزیروں کو ان کی بدنیتی کا صلہ بھی مل گیا۔

(نوٹ: یہ کہانی سزا صلہ صلیح کرگل کی کہانی ہے اور یہ محل اب بھی موجود ہے، مگر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔)

ابوالعلا معری (بال جبریل)

افسوس، صد افسوس کہ شاہین نے بنا تو دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات ا تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم فضیلتی کسی سزا مرگ عذاباۃ





پاکستان کے ثقافتی و روایتی کھیل.....

کبڈی اور کھیل ڈنڈا

نیوزی لینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں آباد ہونا شروع ہوئی تو انہوں نے اس کھیل کو ان ممالک میں بھی روشناس کرایا۔

کبڈی شاید دنیا کا واحد کھیل ہے جس میں نہ تو کسی قسم کے سامان کما اور نہ ہی بڑے میدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبڈی برصغیر کا مقبول ترین کھیل ہے۔ 1900ء میں پہلی بار کبڈی کی ترقی و ترویج کے لیے سوچا گیا۔ 1921ء میں بھارت کے صوبے مہاراشٹر میں بنائے گئے قوانین کے تحت یہ کھیل کھیلا گیا۔ 1923ء میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے ان قوانین کا اطلاق کرا کر آل انڈیا کبڈی ٹورنامنٹ کا انعقاد کرایا۔ جدید کبڈی کو 1930ء میں جنوبی ایشیا میں فروغ ملا۔

1936ء میں یہ کھیل بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا، جب پہلی مرتبہ برلن اولمپکس میں اسے متعارف کرایا گیا۔ اس موقع پر کبڈی کا نمائشی میچ منعقد کیا گیا جسے شائقین نے بے حد سراہا۔ اس کے بعد 1938ء میں یہ کھیل انڈین اولمپکس میں متعارف کرایا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ کھیل اس خطے میں بھی بہت مقبول ہوا۔ آل انڈیا کبڈی فیڈریشن 1950ء میں بنی۔ خواتین کی کبڈی گیمز 1955ء میں منعقد ہوئیں۔

1980ء میں پہلی بار ایشین کبڈی چیمپئن شپ ہوئی۔ اسی

جہاں لوگوں نے ہر شعبہ زندگی میں ترقی کی ہے، وہیں کھیلوں کے حوالے سے بھی دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ اب ایک انسان کمپیوٹر و انٹرنیٹ اور موبائل پہ اکیلا کھیل سکتا ہے۔ یعنی کمپیوٹر و موبائلز پہ ایسی ایسی گیمز ہیں کہ چند منٹ سے لے کر ساری ساری رات ختم نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ان جدید ایجادات نے ہمیں ہمارے علاقائی و دیسی کھیلوں سے دور ہی نہیں بلکہ بہت دور کر دیا ہے۔ یہی علاقائی کھیل تھے جن کی وجہ سے علاقائی کشافیت اجاگر ہوتی تھی۔ کبھی یہ کھیل ہماری ثقافت کا آئینہ دار تھے، آج یہ وقت اور حالات کے ہاتھوں مٹتے جا رہے ہیں۔ چونکہ ہم بہت سے علاقائی کھیلوں میں سے دو اہم ترین کھیلوں کا تذکرہ کریں گے جو کبھی ہمارے شہروں خصوصاً دیہاتوں میں نہایت شوق و اہتمام سے کھیلے جاتے تھے یعنی

1- کبڈی 2- گلی ڈنڈا

کبڈی:

کبڈی، جنوبی ایشیا کا صدیوں پرانا کھیل ہے۔ یہ اس خطے یعنی پاک و ہند کے باسیوں کا مقبول ترین کھیل ہے۔ پاکستانی پنجاب اور بھارتی پنجاب اس کھیل کا سب سے بڑا مرکز ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے علاوہ یہ کھیل بنگلہ دیش اور ایران میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ جیسے جیسے ایشیائی باشندوں کی بڑی تعداد امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ،

سال اس کھیل کو ایشین گیمز کا حصہ بنا لیا گیا۔ پہلی چیمپئن شپ میں بھارت نے بنگلہ دیش کو شکست دی۔ 2004ء میں کبڈی کا پہلا ورلڈ کپ بھارت میں کھیلا گیا جس کے فائنل میں بھارت نے ایران کو شکست دے کر عالمی چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ 2006ء میں 15 ویں ایشین گیمز میں یورپین اور آسٹریلوی شائقین نے بھی اس کھیل میں گہری دل چسپی ظاہر کی جس کے نتیجے میں یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں کبڈی کو فروغ ملا۔ آج کبڈی دنیا کا مقبول ترین کھیل ہے۔ اس کے چار عالمی کپ منعقد ہو چکے ہیں اور ان چاروں عالمی کپ کا فاتح بھارت رہا ہے۔

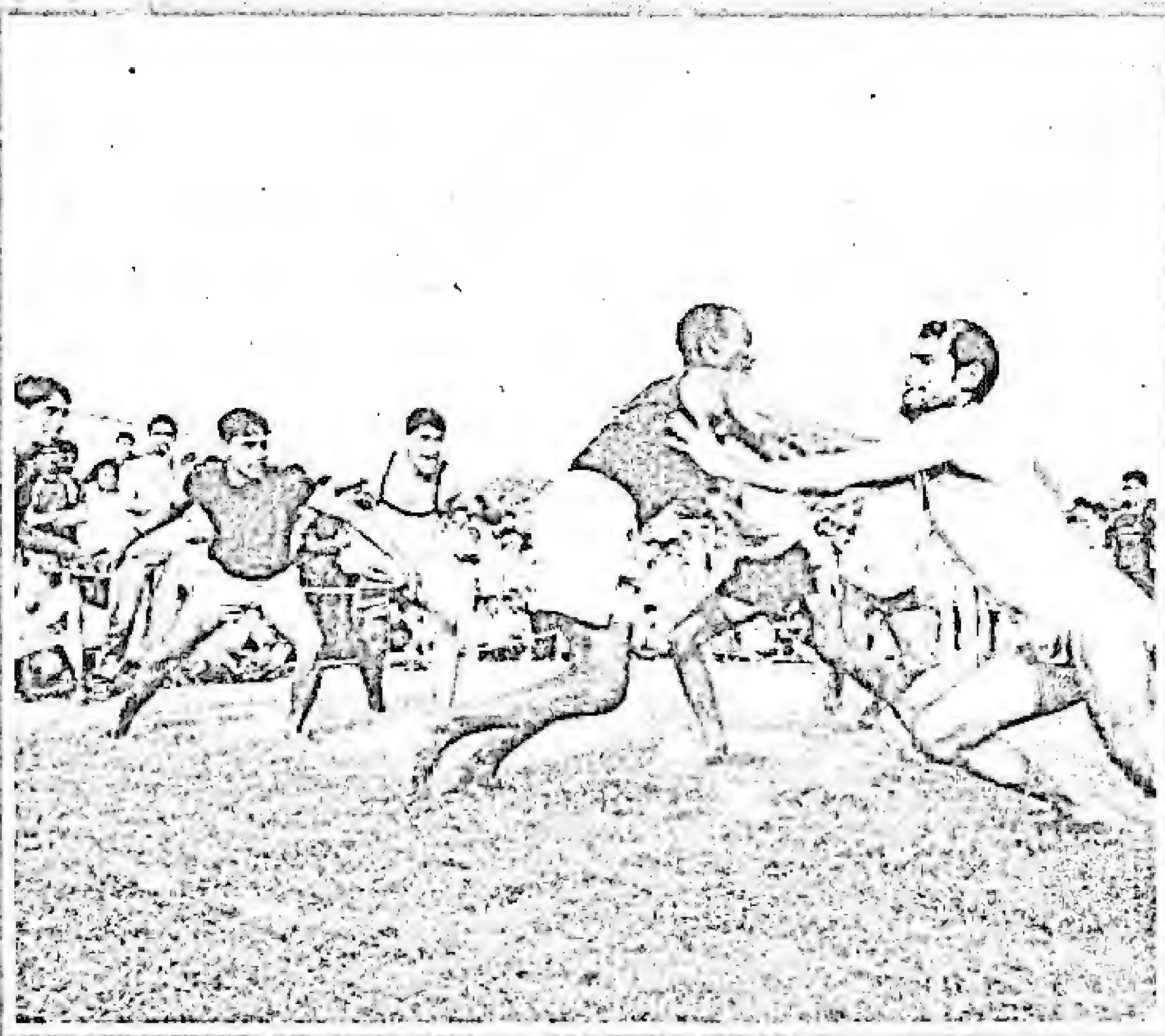
گلی ڈنڈا:

گلی ڈنڈا بھی ایک دل چسپ، انوکھا اور پرانا کھیل ہے۔ یہ کھیل برصغیر میں پنجاب کے جنوبی اور سندھ کے بھی چند علاقوں میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل کھلے میدانوں میں کھیلا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اپنے دور میں مربع بندی کرتے وقت ایسا کیا کہ جتنی جگہ آبادی کے لیے چھوڑی، اتنی ہی جگہ گاؤں کے ایک جانب اور اتنی ہی جگہ دوسری جانب چھوڑی تاکہ لوگ تفریح کے لیے کھیل سکیں۔ اس کھیل میں جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، ایک ڈنڈے اور ایک گلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں درخت سے کھلاڑی

صورت میں باؤنڈری بنائی جاتی ہے۔ کھیلنے والی جگہ پر راب نکالی جاتی ہے۔ راب گلی کے مطابق کھودی جاتی ہے جہاں گلی مخصوص انداز میں منہ اونچا کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ڈنڈا رکھنے کے لیے ڈنڈے جتنی ایک لمائن لگا دی جاتی ہے۔ کھلاڑی میدان میں پھیل جاتے ہیں تو ایک کھلاڑی گلی کو راب میں رکھ کر ڈنڈے سے ضرب لگاتا ہے۔ گلی ہوا میں اچھلتی ہے تو کھلاڑی زور سے گلی کو ڈنڈے سے ضرب لگاتا ہے جس سے وہ ہوا میں اچھلتی دوردست جاتی ہے۔ اگر وہاں موجود کھلاڑیوں میں سے کوئی اس گلی کو کیچ کر لے تو ہٹ لگانے والا کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر ڈنڈے کو اس چھوٹے سے سوراخ کے پاس رکھ دیا جاتا ہے اور میدان میں موجود وہ کھلاڑی جس کے سب سے قریب گلی گری ہو، اس کو اٹھا کر ڈنڈے کی طرف پھینکتا ہے۔ اب اگر گلی ڈنڈے کو لگ جائے تو وہ کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو مسلسل وہی کھلاڑی کھیلتا رہتا ہے۔ یوں ہر کھلاڑی انفرادی طور پر اپنا الگ الگ سکور بناتا ہے۔

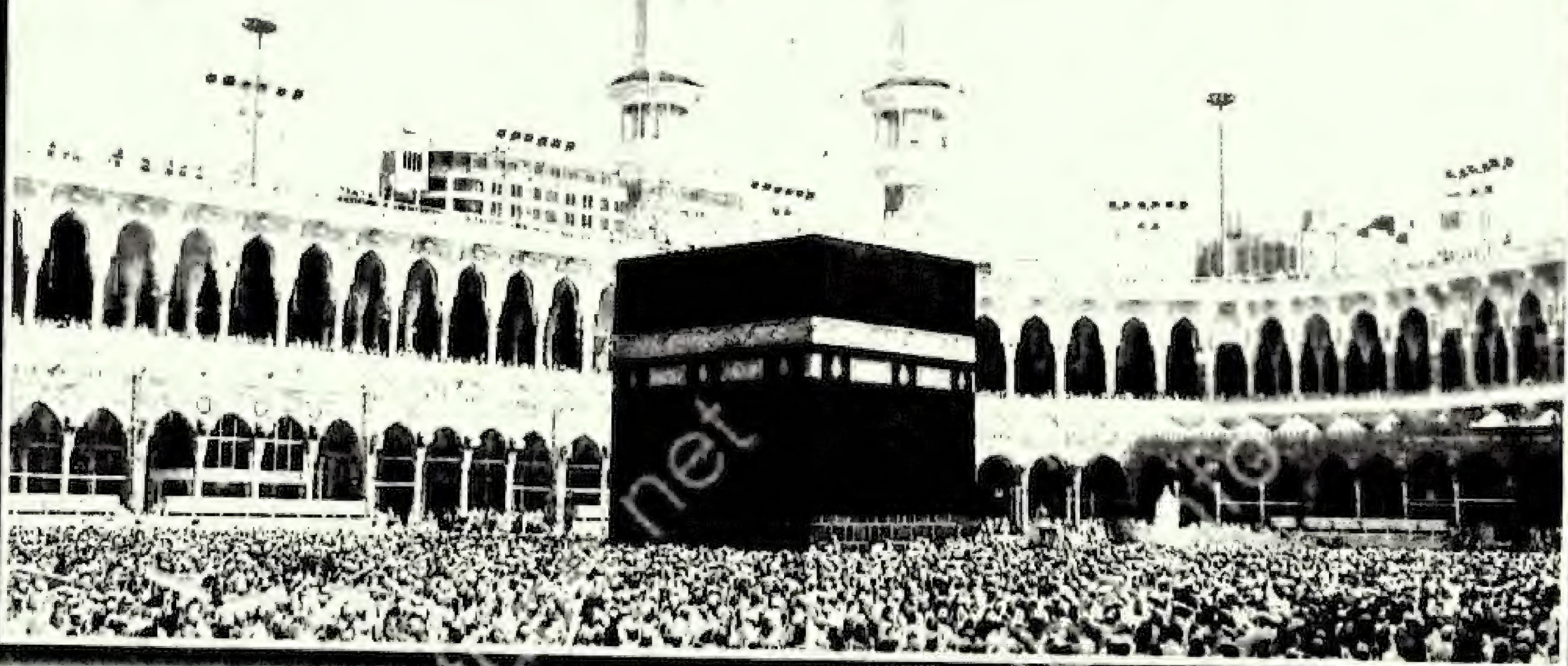
گلی ڈنڈا کا بین الاقوامی سطح پر صرف ایک ہی ٹورنامنٹ منعقد ہوا ہے جو پاکستان اور بھارت کے درمیان کھیلا گیا تھا۔ یہ ٹورنامنٹ پاکستان نے دو تین سے جیت لیا تھا۔

☆☆☆



ایک ڈھائی فٹ یا تین فٹ کا ڈنڈا کاٹتے، پھر اس ڈنڈے کو کسی چھری یا کھلاڑی سے صاف کرتے ہیں۔ اس کے بعد 1/2 فٹ کی خشک لکڑی لیتے ہیں جس کا محیط ایک سے دو انچ ہو۔ اس کو ترکھان سے دونوں سائیڈوں سے تراش خراش کر کے سروں کو گول کروا لیتے ہیں، اس کو گلی کہتے ہیں۔ دو کے علاوہ جتنے چاہیں، کھلاڑی کھیل سکتے ہیں۔ یعنی اس میں کھلاڑیوں کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ کھلے میدان میں گول دائرے کی

پیارے اللہ کے پیارے نام



الْعَفْوُ جَلَّ جَلَالُهُ

(بہت زیادہ معاف کرنے والا)

دیا ہو گا۔ اس خوف میں اسے ایک خیال آیا اور اپنے بیٹوں سے کہا: ”اللہ تعالیٰ کے لیے میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا، اس لیے تم میرے مرنے کے بعد مجھے جلا دینا اور پھر میری آدھی راکھ کو مختلف جگہوں پر زمین میں بکھیر دینا اور آدھی سمندر میں پھینک آنا۔“ اس کے مرنے کے بعد بیٹوں نے ایسا ہی کیا۔

اگرچہ اس کو یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے دوبارہ اسے زندہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اس کی راکھ پوری زمین سے ایک جگہ اکٹھی کر دے۔ زمین تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے، اس نے فوراً ایک ہی لمحے میں اس کی وہ راکھ جو زمین پر تھی اسے جمع کر دیا۔ سمندر کو بھی یہی حکم ہوا تو اس نے بھی زمین کی طرح کیا۔ جب اس مرنے والے کی ساری راکھ جمع ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے دوبارہ زندہ کر دیا اور اس سے اس عجیب و غریب کام کروانے کی وجہ پوچھی۔ (حالاں کہ اللہ تعالیٰ پہلے سے جانتے تھے کہ اس نے اس طرح کیوں کیا) اس شخص نے کہا: ”اے میرے رب! آپ خوب جانتے ہیں، یہ میں نے آپ کے خوف اور ڈر سے سارا کام کروایا تھا۔“

اللہ تعالیٰ نے اس کے اس خوف کی وجہ سے اسے معاف کر دیا اور اس کی مغفرت فرمادی۔

عزیز ساتھیو! اللہ تعالیٰ کے لیے کیا مشکل ہے دوبارہ زندہ کرنا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے ڈر کو اتنا پسند کیا کہ اسے معاف فرما دیا۔

الْعَفْوُ جَلَّ جَلَالُهُ گناہوں کو معاف کرنے والا اور گناہوں کے کرنے پر جو سزائیں ہیں ان سزاؤں کو بھی اپنے بندوں سے ہٹانے والا ہے۔ قرآن کریم میں یہ مبارک نام پانچ مرتبہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرتے ہیں تو معافی کو پسند بھی کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے: ”بدلہ لینے سے معاف کر دینا بہتر ہے۔“

کلاس میں کئی لڑکے اکٹھے پڑھتے ہیں۔ کھیل کے دوران اکٹھے کھیلتے ہیں، گھر میں خاندان کے افراد اکٹھے رہتے ہیں تو اس دوران ایسی باتیں ہو جاتی ہیں جو طبیعت کو اچھی نہیں لگتیں۔ اس ناگواری پر صبر کر کے دوسروں کو معاف کر دینا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ جس طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ہمیں معاف کیا جائے، اسی طرح اگر کسی دوسرے سے بھی غلطی ہو جائے جو ہمیں ناگوار لگے تو وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ اسے بھی معاف کر دیا جائے۔

معافی

پہلے زمانے کی بات ہے کہ ایک شخص کے پاس بہت مال و دولت تھی، لیکن اس نے اپنی عمر میں کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ جب وہ بیمار ہو گیا تو اسے خیال آیا کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا، مرنے کے بعد تو اللہ تعالیٰ مجھے وہ عذاب دیں گے جو کسی اور کو نہ



پوچھو تو جانیں

- 6- میں آ جاؤں تو تم کھلا جاؤ
میں جاؤں تو تم آ جاؤ
- 7- لال گائے لکڑی کھائے
پانی پیئے اور مر جائے
- 8- خود اس کو کب پڑھنا آئے
جو چاہو لکھ کر دکھلائے
- 9- ہر چیز کو جوڑے آپس میں وہ پگی
ایک طرف سے موٹی ہے ایک طرف سے پتی
- 10- ناک چڑھے اور پکڑے کان
بچہ بولو ہے کون شیطان

سوال 10: 8- لکڑی 5- مر جائے
سوال 9: 7- لال گائے 6- میں آ جاؤں تو تم کھلا جاؤ

- 1- جس شے کو ہر دیس میں پایا
اس کی صورت ہے نہ سایہ
- 2- بات چھے نہ اس سے اصلی
گن لے سب کی ہڈی پھلی
- 3- آندھی ہو یا تیز ہوا
کبھی بچھے نہ ایک ذرا
- 4- باتوں باتوں میں وہ کھایا
کھا کر بھی ثابت ہی پایا
- 5- رتی بھر سا پیٹ
کھا گئی سارا کھیت

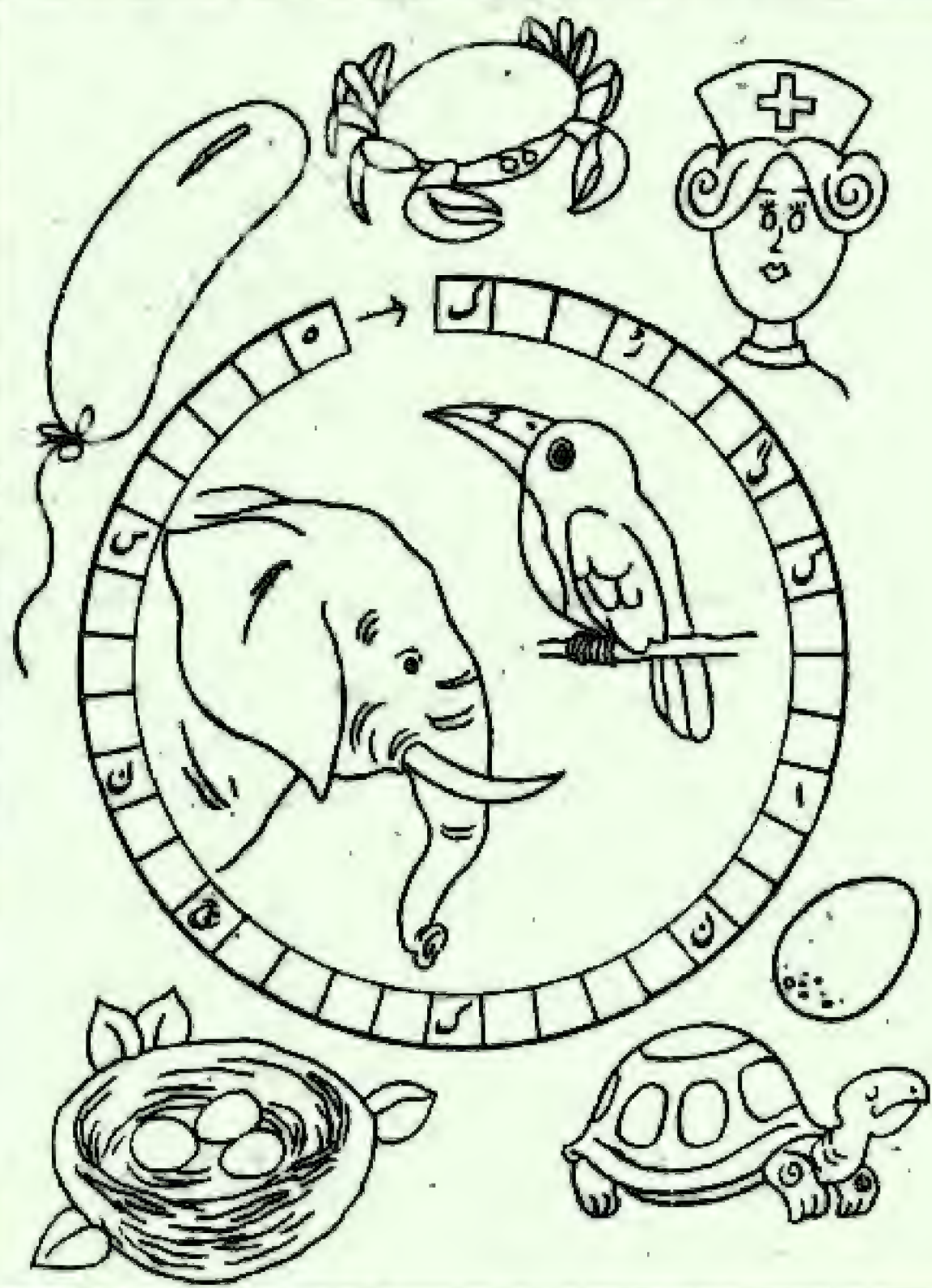
ارے بھئی کہاں چلے؟

ہندسوں کو احتیاط سے مکمل کیجئے۔ شاید پتا چل سکے کہ پرندے کہاں جا رہے ہیں!



دائرے میں کیا ہے؟

ان تصویروں میں سے کچھ کے نام مکمل حروف میں دائرے میں لکھے ہوئے ہیں
کیا آپ انہیں مکمل کر سکتے ہیں؟



حضرت بایزید بسطامیؒ

اندھیری اور بھیا تک رات تھی۔ ساری دنیا سو رہی تھی۔ دس گیارہ سال کا ایک بچہ ٹٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی میں بیٹھا اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ قریب ہی اس کی ماں بستر پر میٹھی نیند سو رہی تھی۔ یکا یک ماں نے نیکے سے سراٹھا کر کہا۔

”بیٹا! پیاس لگی ہے۔ گور پانی پلانا۔“ بچے نے کتاب بند کر دی اور فوراً صراحی تک پہنچا۔ صراحی خالی تھی۔ بچہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر گھر سے باہر نکلا کہ کسی ہمسائے کو آواز دے کر پانی مانگ لے لیکن پھر خیال آیا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ پڑوسی دن بھر کے کام کاج کے بعد سو رہے ہوں گے۔ انہیں جگانا ٹھیک نہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ جہاں مکانات ختم ہوتے ہیں، وہاں پانی کا کنواں ہے۔ اندھیری رات اور ہو کا عالم۔ باہر انسان تو کیا چرند پرند بھی دکھائی نہ دیتے تھے لیکن اپنی ماں کا خدمت گزار اور باہمت بیٹا صراحی اٹھا کر کنوئیں تک پہنچ ہی گیا۔ جلدی سے پانی بھر کر واپس آیا اور گلاس لے کر ماں کے بستر تک گیا۔ ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ماں کو اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ آخر وہ پانی سے بھرا ہوا گلاس لیے سرہانے خاموش کھڑا رہا۔ سوچا کہ جب اماں اٹھیں گی تو پانی پلا دوں گا۔ وقت گزرتا گیا لیکن ماں اسی طرح آرام سے سوئی رہی۔ آخر صبح ہو گئی اور ماں کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خدمت گزار بیٹا ہاتھ میں پانی کا پیالہ لیے کھڑا ہے۔ پہلے تو ماں کچھ نہ سمجھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ رات اس نے بچے سے پانی مانگا تھا۔ محبت کے جوش میں اس نے بچے کو سپنے سے لگا لیا۔ اور دعا کی کہ

”اے اللہ! تو میرے بچے کا بھی اتنا ہی خیال رکھنا جتنا اس نے میرا خیال رکھا۔“

ماں کی دعا قبول ہوئی اور وہ بچہ بڑا ہو کر ایک بڑے مرتبے کا بزرگ بنا جسے آج دنیا بایزید بسطامیؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بڑے بڑے اللہ والے بزرگ بھی ان کے طریقے پر چلنے کو اپنے لیے باعثِ برکت سمجھتے ہیں۔

بچو! آپ کو نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ بھی بایزید بسطامیؒ کے طریقے پر چلیں اور جہاں تک ہو سکے ماں کی خدمت کریں۔ کبھی اپنی امی اور ابا کو خفا نہ کریں۔ ہمیں معلوم ہے آپ یقیناً اپنی امی اور ابا کو خفا نہیں کریں گے اور ہمیشہ اچھے بچوں کی طرح ان کا کہا مانیں گے۔

(ترجمین فاطمہ علوی، کراچی)

ہر مل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اکتوبر 2015ء ہے۔

نام: _____

مقام: _____

مکمل پتا: _____

موبائل نمبر: _____

ہر مل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اکتوبر 2015ء ہے۔

نام: _____

شہر: _____

مکمل پتا: _____

موبائل نمبر: _____

ہماری زندگی کے مقاصد

کوپن نہ کرنا اور باہر دے سائز رنگین تصویر بھیجا ضروری ہے۔

نام: _____

شہر: _____

مقاصد: _____

موبائل نمبر: _____

اکتوبر کا موضوع ”مکمل گئے والا“ ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 اکتوبر 2015ء ہے۔

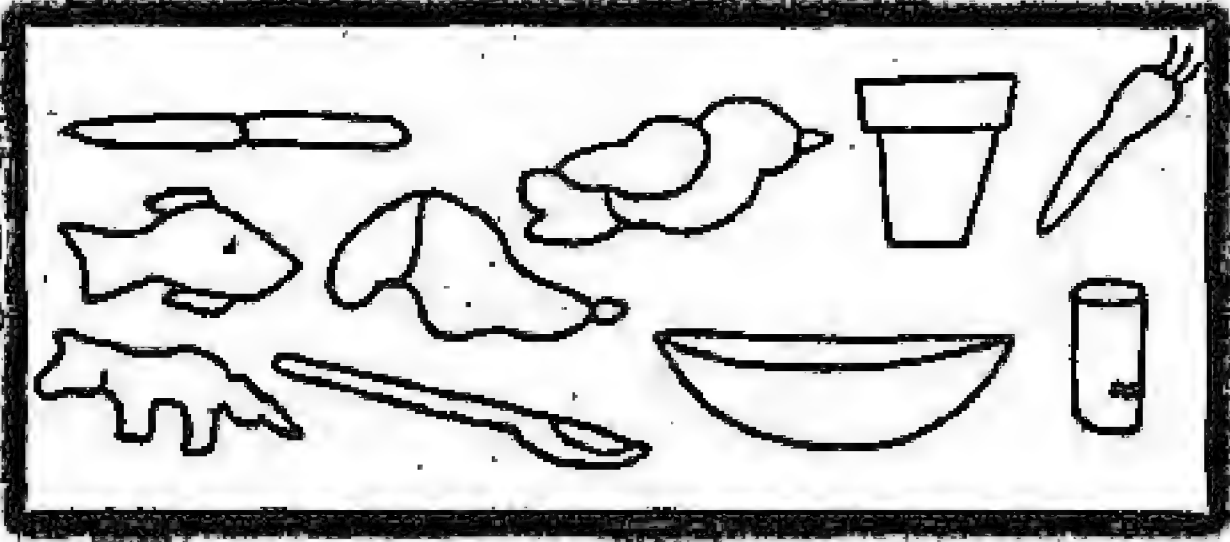
ہم ہمارے مقاصد

نام: _____

عمر: _____

مکمل پتا: _____

موبائل نمبر: _____



اوچھل خاکے

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔





محمد اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ
میں بڑا ہو کر وکیل بنوں گا
اور مظلوموں کی مدد کروں گا۔



ماہمون شفقت، اکوڑہ خشک
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا۔



عائشہ گل سید، چارسدہ
میں پائلٹ بن کر پاکستان کا
نام روشن کروں گی۔



محمد زبیر، بہاول پور
میں ایک کارآمد شہری اور
ڈاکٹر بنوں گا۔



زاوش چودھری، ایبٹ آباد
میں آری ڈاکٹر بن کر اپنے ملک
کا نام روشن کروں گی۔



تو قیر احمد، گلبرگ
میں ایک اچھا انسان بنوں گا۔



محمد اسد جاوید، شیخوپورہ
میں بڑا ہو کر ایک ایمان دار
بنک منیجر بنوں گا۔



نمیرہ محمود، لاہور
میں استانی بنوں گی اور غریب
بچوں کو مفت پڑھاؤں گی۔



قریم کریم، کراچی
میں ایک کامیاب کرکٹ پیشہ
بنوں گا اور پاکستان کا نام
روشن کروں گا۔



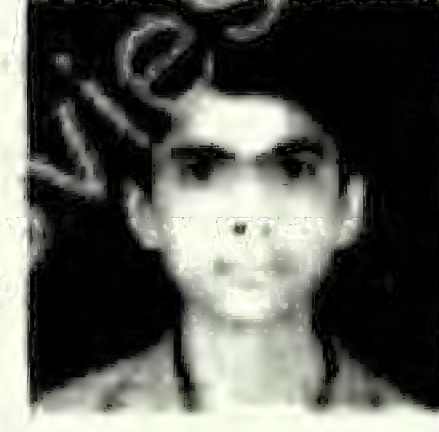
نمرہ فاروق، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا
مفت علاج کروں گی۔



محمد عبداللہ، وارپن
میں پائلٹ بن کر ملک کی حفاظت
کروں گا۔



نوال خان، ڈیرہ غازی خان
میں ڈاکٹر بن کر پاکستان کا
نام روشن کروں گا۔



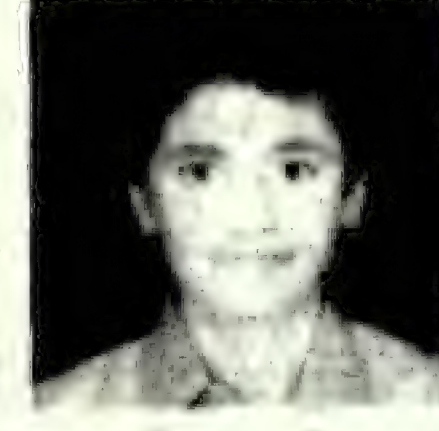
محمد احمد، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک و قوم
کی خدمت کروں گا۔



محمد عمر یاسر، گوجرانوالہ
میں انجینئر بن کر ملک کا نام روشن
کروں گا۔



احمد رضا قادری، گوجرانوالہ
میں بڑا ہو کر دین کی خدمت
کروں گا اور غریبوں کی مدد
کروں گا۔



محمد وقاص، جھنگ صدر
میں ایک اچھا قاری اور
ڈاکٹر بنوں گا۔



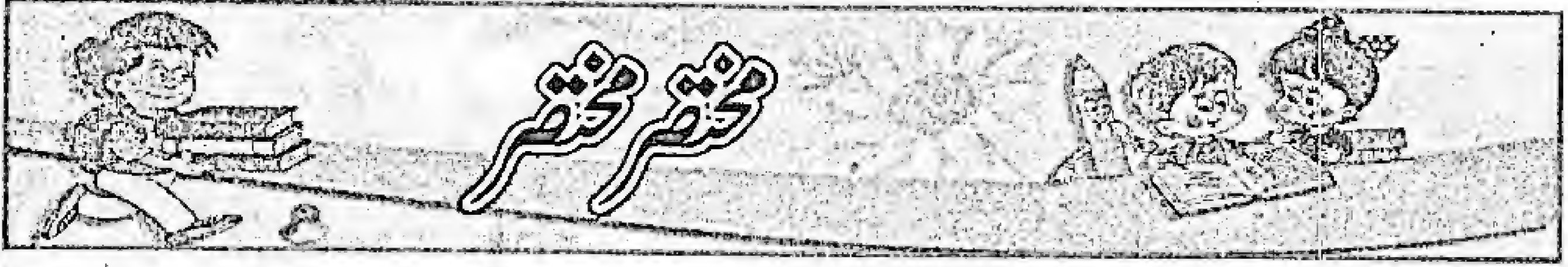
عزہ جمیل، پشاور
میں پائلٹ بن کر ملک کی
خدمت کروں گا۔



رانا محمد حسین، کوٹ رادھا کشن
میں فوجی بن کر ملک کی حفاظت
کروں گا۔



ابدال شفقت، اکوڑہ خشک
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔



ہو جس میں آسانی سناؤ
دادی اماں کہانی

(شاہد حسین)

دوستی مت کرنا

- ☆ غرض مند لالچ سے.....
- ☆ بدکار اور مکار سے.....
- ☆ دوست کے دشمن اور دشمن کے دوست سے.....
- ☆ چمچھورے اور شیخی خورے سے.....
- ☆ بے جانے بوجھے اور بخیل سے.....
- ☆ بے وقوف اور بھولی گوانی دینے والے سے.....
- ☆ جس شخص سے ماں باپ منع کریں.....
- ☆ بے جا کلام اور زیادہ قسمیں کھانے والے سے.....

☆

یا اللہ مجھے بچا

- ☆ ایسی غیند سے جس سے فجر کی نماز قضا ہو۔
- ☆ ایسی مصروفیت سے جس سے ظہر کی نماز قضا ہو۔
- ☆ ایسی سستی سے جس سے عصر کی نماز قضا ہو۔
- ☆ ایسی محفل سے جس سے مغرب کی نماز قضا ہو۔
- ☆ ایسی تھکاوٹ سے جس سے عشاء کی نماز قضا ہو۔

(ماہرہ حنیف، بہاول پور)

سنہری بول

- ☆ بُرے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔
- ☆ حقیر سے حقیر پیشہ بھیک مانگنے سے بہتر ہے۔
- ☆ غرو سے آدمی کا دین ضائع ہو جاتا ہے۔
- ☆ خاموشی شکر کا حسن ہے۔
- ☆ نفرت دل کا پاگل پن ہے۔
- ☆ بخیل ہمیشہ ڈیل ہوتا ہے۔
- ☆ جو سوچتے کم ہیں، وہ بولتے زیادہ ہیں۔

صفائی نامہ

صفائی سی اب ہو گئی ہر طرف
اجالا ہوا ہے یہاں صف بہ صف
صفائی کا چرچا ہوا عام ہے
یہ سب کو صفائی کا پیغام ہے
صفائی سے سب تم محبت کرو
غلاظت سے ہر آن نفرت کرو
کوئی چیز بھی بچوا کھائیں گے جب
جراثیم تم کو ستائیں گے تب
غلاظت سے بچنے کا ہے یہ علاج
صفائی کا ضامن توانا دماغ
جراثیم سے سب کرو تم جہاد
صفائی کا نعرہ ”رہو زندہ باؤ“
صفائی تو ہے نصف ایمان بھی
کر توڑ دی جس نے شیطان کی

(ضیاء اللہ محسن)

دادی اماں کہانی سناؤ

دادی اماں کہانی سناؤ
چاہے نئی یا پرانی سناؤ
ظالم جن یا سبز پری کی
طوطے یا جادو کی چھڑی کی
ہو جس پر حیرانی سناؤ
دادی اماں کہانی سناؤ
گڈے یا پھر ہاک گڑیا کی
چاند پہ بیٹھی اس بڑھیا کی
پڑھ کے یا پھر زبانی سناؤ
دادی اماں کہانی سناؤ
شہزادے یا شہزادی کی
جنگل کی یا آبادی کی

☆ کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو کہو..... ان شاء اللہ

☆ کچھ اچھی خبر سنو تو کہو..... سبحان اللہ

☆ کسی کی تعریف کرنا ہو تو کہو..... ماشاء اللہ

☆ شکریہ ادا کرنا ہو تو کہو..... جزاک اللہ

☆ کسی کو رخصت کرنا ہو تو کہو..... فی امان اللہ

☆ جب خوش گواری ہو تو کہو..... تبارک اللہ

☆ غلط کام پر افسوس کرنا ہو تو کہو..... استغفر اللہ

☆ موت کی یا حادثہ کی خبر سنو تو کہو..... انا للہ وانا الیہ راجعون

☆ جب ناگواری ہو تو کہو..... اعوذ باللہ (ہارون اشرف، رابعہ جنگ)

قرآن حکیم کا فرمان

☆ اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرو اور انہیں اُف تک نہ کہو۔

☆ بے شک نرا بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔

☆ زمین پر اتر کر نہ چلو کیوں کہ تم اسے پھاڑ نہیں سکتے۔

☆ نیک کام کرو تا کہ تم کام یاب رہو۔

☆ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

☆ خدا کسی دغا باز اور مکار کو پسند نہیں کرتا۔

☆ ایک جماعت دوسری جماعت کا مذاق نہ اڑائے۔

☆ تم آپس میں ایک دوسرے کے نام نہ بگاڑو۔

مہمان کا سامان

☆ جناب والا کہ یہ سات منزلہ صندوق؟

☆ کسی مکان کے لیے ہے کہ لامکان کے لیے؟

☆ جناب اس کا آٹھ ایک پٹ اکھڑ سکیں

☆ تو کام آئے مچلے میں ساتباں کے لیے

☆ جناب نے جو گھڑایا ہے اس زمانے میں

☆ مجھی بنا تھا تجل حسین خاں کے لیے

☆ جناب اس میں جو سامان شخص کے لائے ہیں

☆ یہ خاندان کے لیے ہے کہ سب جہاں کے لیے

☆ لحاف، تکیہ، ترازو، تندور، غرضیکہ!

☆ ”صلائے عام ہے یا زالہ نکتہ داں کے لیے“

☆ جناب خود ہی بتائیں کہ ہم کہاں رکھیں!

☆ نہ یہ زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

(سید ضمیر جعفری) (مرسلہ: وقار صادق، راول پنڈی)

☆ کم بولنا عقل مندی ہے۔

☆ عقل سے بہتر ہمارا کوئی رفیق نہیں۔

☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔

☆ زیادہ ہنسنا موت سے غفلت کی نشانی ہے۔

☆ قلم تلواری سے زیادہ طاقت ور ہے۔

☆ مومن بار بار دھوکا نہیں کھاتا۔ (ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ)

انمول باتیں

☆ جن لوگوں کے خیالات اچھے ہوتے ہیں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

☆ اگر تم بادشاہ ہو تب بھی استاد والدین کی تعظیم میں کھڑے ہو جاؤ۔

☆ ہر کسی کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤ گے تو وہ تمہاری اتنی ہی

عزت کرے گا جتنی تم اس کی۔

☆ جس کام کو پورا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اس کا ذمہ نہ اٹھاؤ۔

☆ مومن کے لیے اتنا علم کافی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتا رہے۔

☆ آنکھ دل کا دروازہ ہے، اس کی حفاظت کرو کیوں کہ تمام آفات

اس سے بدن میں داخل ہوتی ہیں۔

☆ اجڑے ہوئے دل کو آباد کرو گے تو کل تمہارے دل میں بھی

اُجالا ہوگا۔ (محمد افضل انصاری لاہور)

اقوال زریں

☆ خامیوں کا احساس کام یابیوں کی کنجی ہے۔

☆ ناکامی کام یابی کی طرف پہلی سیڑھی ہے۔

☆ ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم ہے۔

☆ حوصلہ کبھی نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی اونچی ہے۔

☆ زندگی ایک ایسی شمع ہے جو ہوا میں رکھی ہوتی ہے۔

☆ غم کو برداشت کرنا بھی عبادت ہے۔

☆ کچھ کھانے کی خواہش ہو تو غم کھاؤ۔

☆ کچھ پینے کی خواہش ہو تو غصہ پیو۔

☆ کچھ جمع کرنے کی خواہش ہو تو آخرت کے لیے نیکیاں جمع کرو۔

☆ کچھ دینے کی خواہش ہو تو صدقہ و خیرات دو۔ (آمنہ اختر)

کلمات و برکات

☆ کوئی کام شروع کرو تو کہو..... بسم اللہ

☆ چھینک آئے تو کہو..... الحمد للہ

☆ خدا کے نام پر دو تو کہو..... فی سبیل اللہ



بیف روست

مٹن ملائی کباب

مٹن ملائی کباب

بکری کا قیر: ایک کلو	پیاز باریک: دو عدد کٹا ہوا	سبز مرچ: دو عدد کٹی ہوئی	سرخ مرچ پیسی ہوئی: آدھا چائے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ	گرم مصالحہ: آدھا چائے کا چمچ	دھنیا پسا ہوا: ایک چائے کا چمچ	ڈبل روٹی کا سلائس: ایک عدد
دودھ: آدمی پیالی	اٹھ: آدھا پیسٹا ہوا	میدہ: حسب ضرورت	فریش کریم: آدمی پیالی
سبز دھنیا: ایک کھانے کا چمچ	ادرک، کٹا ہوا: آدھا کھانے کا چمچ	کوکنگ آئل: حسب ضرورت	

گارنشنگ کے لیے:

سرخ مرچ: ایک چوتھائی چائے کا چمچ	گرم مصالحہ: ایک چوتھائی چائے کا چمچ	سبز دھنیا: دو کھانے کے چمچ کٹا ہوا	نمک: حسب ذائقہ
----------------------------------	-------------------------------------	------------------------------------	----------------

ترکیب:

آدمی پیالی دودھ میں ڈبل روٹی کے سلائس بھگو دیں۔ گہرے پیالے میں قیر، پیاز، سبز مرچ، ادرک، سبز دھنیا اور ڈبل روٹی کا سلائس دودھ سے نکال کر نچوڑ کر ملا لیں۔ نمک، سرخ مرچ، پسا ہوا دھنیا، گرم مصالحہ اور اٹھ بھی قیر میں ڈال کر ہلکی سی آگ پر اچھی طرح مکس کریں۔ قیر کو مساوی حصوں میں تقسیم کر کے چپے پھر اٹھ کے شکل کے کباب بنالیں۔ میدہ ایک پلیٹ میں بھلا کر کبابوں کو اس میں رول کریں۔ فرائنک پن میں آئل گرم کریں، تمام کبابوں کو چاروں اطراف سے گولڈن تل لیں۔ بیکنگ ڈش میں کباب رکھ کر اوپر سے فریش کریم ڈال دیں۔ چار نمک، مرچ، گرم مصالحہ اور ایک کھانے کا چمچ سبز دھنیا چھڑک کر پہلے سے گرم اوون میں دو سو ڈگری سینٹی گریڈ پر پیل مٹن بیک کریں۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر کبابوں کے اوپر کٹی ہوئی سبز مرچ اور سبز دھنیا چھڑک دیں۔ لذیذ مٹن ملائی تیار ہیں۔

بیف روست

اجزاء:

گائے کا انڈرکٹ گوشت: ایک کلو یا ثابت ران کا پیس	لہسن، ادرک پسا ہوا: دو کھانے کے چمچ	دہی: ایک کپ
سرکہ: ایک چوتھائی کپ	سیاہ مرچ: ایک چائے کا چمچ	چلی سوس: ایک کھانے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ پسا ہوا	پیتا یا گوشت گلانے کا پاؤڈر	تخمی: حسب ضرورت

ترکیب:

انڈرکٹ گوشت یا ران کا پیس لے کر اس کو کانٹے کی مدد سے اچھی طرح گود لیں۔ پھر تمام مصالحے ملا کر اسے ایک دن کے لیے رکھ دیں۔ ایک پتلی میں دو کھانے کے چمچ گھی ڈالیں اور بغیر پانی کے گوشت کو اسے دو گھنٹے کے لیے ہلکی آگ پر رکھ دیں۔ جب گل جائے اور سرخ ہو جائے تو اُتار لیں۔ لذیذ روست تیار ہے۔ اگر چاہیں تو ایک کپ پانی بھی ڈال سکتی ہیں۔

برابر تھے۔ اکبر بادشاہ اعلیٰ منتظم تھا۔ آپ نے متعدد علاقے فتح کر کے سلطنت میں شامل کیے۔ اقلیتوں خاص کر ہندو اور راجپوت قوم کو بڑی اہمیت دی۔ اکبر بادشاہ نے ٹیکسوں کا نظام متعارف کروایا اور فوجی قوت بڑھائی۔ آگرہ کے نزدیک صوفی بزرگ حضرت سلیم چشتیؒ سے اکبر بادشاہ نے روحانی فیض حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر بادشاہ نے آگرہ شہر کو دارالخلافہ بنایا۔ اکبر بادشاہ نے تجارت کو فروغ دیا اور نئے نئے سکے (Coins) بھی متعارف کرائے۔ اکبر بادشاہ کے مشاغل میں تصویر کشی، تلواریں چلانا اور گھڑ سواری شامل تھے۔ جلال الدین محمد اکبر نے 27 اکتوبر 1605ء کی بوجہ پیٹ کے مرض وفات پائی۔ آپ کو سکندرہ، آگرہ (بھارت) کے مقام پر دفن کیا گیا۔

شہد کی مکھی

شہد کی مکھی (Honey Bee) کا سائنسی نام "APIS" ہے۔ اس کا تعلق فائلم آرٹھروپوڈا کی کلاس "Insecta" سے ہے۔ ان کی 20,000 انواع (Species) ہیں۔ اس کا ذکر قرآن حکیم کی سورت مبارکہ النحل پارہ 14 میں بھی موجود ہے۔ شہد کی مکھیوں کا مطالعہ کرنا "Apiology" کہلاتا ہے۔ انسان صدیوں سے انہیں شہد اور موم (Bees Wax) کے لیے پال بھی رہا ہے۔ نر مکھیوں کو ڈرونز (Drones) کہا جاتا ہے۔ مادہ مکھی کو ملکہ (Queen) کہتے ہیں۔ شہد کی چھوٹی مکھی کو "Apis Florea" کہتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں 10 ڈگری سینٹی گریڈ (50 فارن ہائیٹ) سے نیچے درجہ حرارت پر اڑنا چھوڑ دیتی ہیں اور چھتے



جلال الدین محمد اکبر

ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا تیسرا اہم ترین بادشاہ کا نام جلال الدین محمد اکبر تھا۔ آپ 15 اکتوبر 1542ء کو پیدا ہوئے۔ آپ 11 فروری 1556ء سے 27 اکتوبر 1605ء تک حکمران رہے۔ آپ کی پہلی شادی رقیہ سلطان بیگم سے ہوئی۔ بعد ازاں مختلف ادوار میں شادیاں کیں۔ اندازاً آپ نے 13 شادیاں کیں۔ اکبر



بادشاہ کے والد کا نام ہمایوں تھا جب کہ والدہ کا نام حمیدہ بانو بیگم تھا۔ اکبر بادشاہ نے ابوالفضل اور فیضی جیسے اساتذہ سے فیض حاصل کیا لیکن باضابطہ تعلیم حاصل نہ کی۔ مشہور شخصیات جیسے ہیر بل، تان سین، ملا دو پیازہ، راجہ مان سنگھ وغیرہ ان کے دربار میں وزراء کے

مشکل بنایا جاسکے۔ زمین میں بنائے گئے یہ سوراخ دائیں اور بائیں رخ پر رکھے جاتے ہیں۔ ان سوراخوں کو "Dogleg" کہا جاتا ہے۔ گولفر (اس کھیل کا کھلاڑی) گیند کو زمین سے کچھ بلند رکھنے کے لیے "Tee" استعمال کرتا ہے جو لکڑی کا ٹکڑا (Peg) ہوتا ہے۔ آج کل Tee پلاسٹک کے بھی بن رہے ہیں۔ جس سٹک کی مدد سے گیند کو مارا جاتا ہے اسے "Club" یا "Driver" کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں اس کے ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں۔

سیاہی

سیاہی کو انک (Ink) بھی کہتے ہیں جس کی مدد سے لکھا، چھاپا اور شائع کیا جاتا ہے۔ اس مائع نما ڈائی (Dye) یا پگمنٹ (Pigment) کی مدد سے لکھا، چھاپا اور شائع کیا جاتا ہے۔

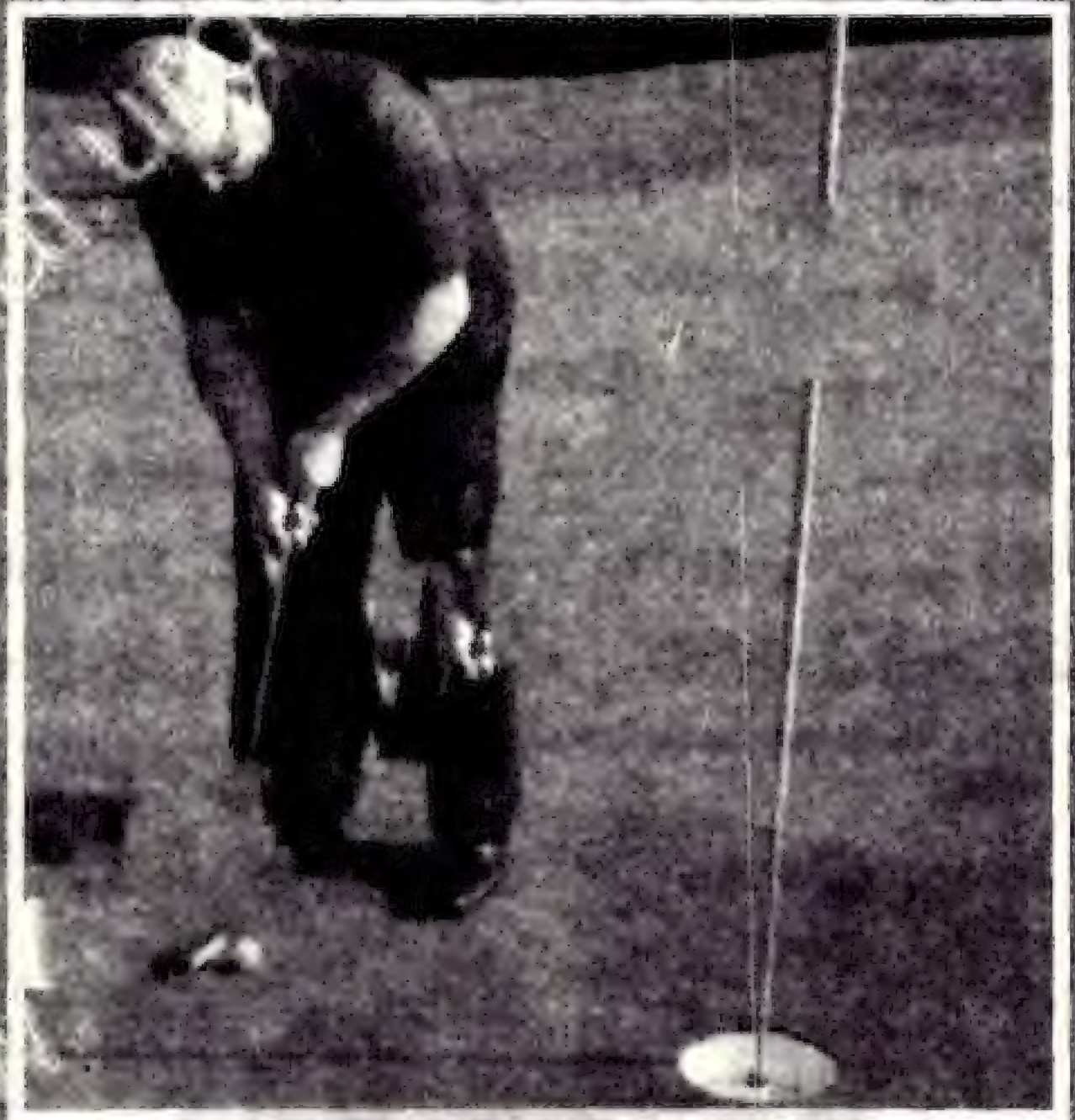


کو قلم، برش یا پد (Quill) کی مدد سے ڈرائنگ یا تحریر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سیاہی کو مختلف مقاصد جیسے کڑی کی چھپائی، کتابوں، اخباروں وغیرہ میں استعمال کرنے کے لیے اس میں کئی کیمیائی مادے شامل کیے جاتے ہیں۔ سیاہی کو آبی (Aqueous)، مائع، پیسٹ (Paste) یا پاؤڈر کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سیاہی کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ قدیم چینی تاریخ بتاتی ہے کہ پلانٹ ڈائے (Plant Dyes) سے سیاہی یا روشنائی 32 قبل مسیح تیار کی گئی اور جانوروں کے پردوں کو بطور قلم استعمال کیا گیا۔ آج کی روشنائی یا سیاہی ڈیجیٹل پرنٹرز میں بھی کام آتی ہے۔ سیاہی میں کیمیکلز ہوتے ہیں، اس لیے انک یا سیاہی کا پیسٹ میں جانا نقصان پہنچاتا ہے۔ ووٹرز (Voters) کے انگوٹھے پر جو سیاہی لگاتے ہیں اس ان منٹ سیاہی کو "Indelible" انک کہتے ہیں۔

میں قیام کرتی ہیں۔ یہ پھولوں کا رس چوستی ہیں جسے "Nectar" کہتے ہیں۔ کارکن کھیاں (Worker Bees) پیسٹ سے مادہ خارج کرتی ہیں جو مہصہ (Bee Wax) بناتا ہے۔ ان کے منہ پر ڈنک ہوتا ہے جو دفاع میں کردار ادا کرتا ہے۔ ان کا تیار کردہ شہد بطور غذا، دوا اور ڈشوں کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ چین، ترکی، ارجنٹائن، یوکرین اور امریکہ دنیا کے بڑے شہد پیدا کرنے والے ممالک ہیں۔ شہد کاربوہائیڈریٹس کا خزانہ ہے۔ شہد کی مکھی (Honey Bees) کے نام پر فلمیں، ڈرامے، کارٹونز اور ڈاکو میٹری بنائی جا چکی ہیں۔ مصری تہذیب میں شہد کی مکھیوں کو رشتوں کی مضبوطی دکھانے کے لیے بطور علامت ظاہر کیا جاتا تھا۔ شہد کی مکھی کی چھ ٹانگیں ہوتی ہیں اور یہ پردوں کی مدد سے اڑتی ہیں۔

گولف

گولف (Golf) ایک کلب اور بالی کا کھیل ہے۔ یہ کھیل ایسے جمیدالہا میں ہوتا ہے جس کی کوئی خاص حد مقرر نہیں۔ 9 یا 18



سوراخ (Hole) ہوتے ہیں۔ ان سوراخوں میں کھلاڑی ایک اسٹک (Stick) کی مدد سے گیند پھینکتا ہے جو کم سے کم ہٹ (Hit) کر کے آخری سوراخ تک گیند پہنچاتا ہے، وہ فاتح قرار پاتا ہے۔ گولف کے کھیل نے 15 ویں صدی میں اسکاٹ لینڈ سے جنم لیا۔ اس سے قبل قدیم رومن بھی اس کھیل سے واقف تھے۔ گراؤنڈ جس میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے، اس کی سطح اور اس پر اُگی گھاس کی سطح مختلف مقامات پر مختلف رکھی جاتی ہے تاکہ کھیل کو دل چسپ و

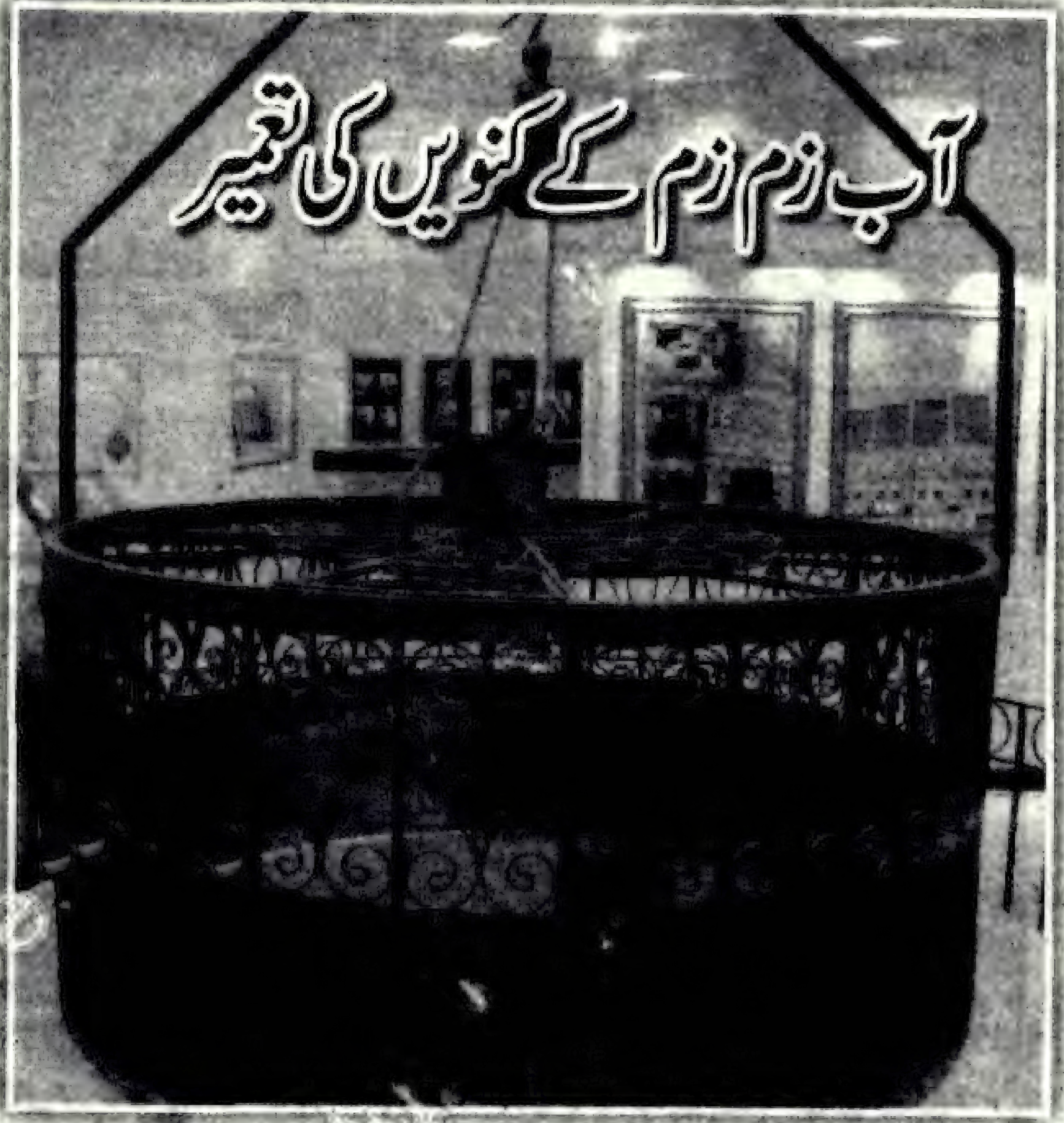
انہوں نے اپنے بیٹے حارث کی مدد سے کنواں کھودا تو وہاں سے پانی برآمد ہوا۔ یہ چشمہ آج تک جاری ہے۔

زم زم کا کنواں مریخ پتھروں پر بنا ہوا ہے۔ یہ سترہویں صدی عیسوی کی تعمیر ہے۔ موجودہ عمارت جس میں زم زم کا کنواں واقع ہے، 1661ء میں عثمانی ترکوں کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ کنواں کعبے سے جنوب مشرق کی طرف 33 گز کے فاصلے پر حجر اسود کی دیوار کے بالمقابل واقع ہے اور 140 فٹ گہرا ہے۔ زم زم کے کنویں کے اوپر چوکور عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں شمال کی جانب دروازہ ہے۔ کمرے میں خوبصورت سنگ مرمر سے چکی کاری کی گئی ہے۔ کنواں عمارت کے عین درمیان میں ہے جس کے ساتھ ہی ایک حوض ہے جو ہر وقت آب زم زم سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ

ٹونیاں لگی ہوئی ہیں جہاں کنویں کے گرد پانچ فٹ منڈیر ہے۔ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے ٹیوب ویل لگے ہیں۔ 1374ھ میں شاہ عبدالعزیز آل سعود نے دور میں دو سیلیں سنگ مرمر کی بنائی گئیں اور زم زم کے لیے نئی عمارت کی تعمیر کروائی گئی اور پانی نکالنے کا نیا طریقہ ترک کر کے نیا طریقہ زیر استعمال لایا گیا۔ اس میں دو بڑی بڑی ٹینکیاں رکھی گئی ہیں جن کے ساتھ چوبیس بڑے ٹن ہیں۔ اس کے علاوہ لطاف کی کئی دفعہ توسیع کی گئی تاکہ زم زم سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

آب زم زم کی مقدار کا کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس علاقے میں پہلی کوشش 1391ھ میں سعودی وزارت زراعت نے کی۔ ایک ماہر نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس چشمہ سے ایک منٹ میں 164 سے لے کر 217 گیلن پانی پھوٹتا ہے۔ بین الاقوامی کمیٹی نے اندازہ لگایا کہ ایک گھنٹے میں 60 میٹر تک پانی نکلتا ہے۔ سب سے آخری رپورٹ جو اس کے متعلق موصول ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک سیکنڈ میں 11 اور 18 لیٹر کے درمیان پانی نکلتا ہے۔ اس بات پر سب ماہرین کا اتفاق ہے کہ چشمہ کا پانی تین پتھروں کے درمیان سے پھوٹتا ہے۔ یہ پتھر کعبہ صفا اور مردہ کی طرف سے آرہے ہیں اور زم زم کے کنویں پر ملتے ہیں۔ ☆☆

آب زم زم کے کنویں کی تعمیر



آب زم زم وہ چشمہ ہے جسے خداوند کریم نے اپنی رحمت اور حکمت سے سرزمین عرب کے گرم اور پتے ریگزاروں میں خشک پتھروں کے درمیان تقریباً چار ہزار سال قبل حضرت اسماعیلؑ کی تشنہ لہی کو دور کرنے کے لیے جاری کیا تھا۔ یہ چشمہ بیت اللہ (مکہ معظمہ) میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت حاجرہ اور شیرخوار بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر عرب کے ریگستانوں میں آئے۔ قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ کداسے مکہ کے نشیبی علاقے کی طرف آئے اور زم زم کے مقام پر حضرت ہاجرہ کی اجازت سے وہاں بس گئے۔ مکہ معظمہ کی یہ پہلی باقاعدہ آبادی تھی۔ اسی مقام پر بعد ازاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اہل فارس بھی ادھر آئے۔ ایران کا بادشاہ ساسان بن بابق جو ساسانی خاندان کا بانی تھا، 266 قبل مسیح میں اس چشمے کی زیارت کو آیا۔ اسلام سے پہلے ایرانی بھی اس کنویں سے برکت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ جب بنو جرہم مکہ سے جانے لگے تو انہوں نے قریش کے مشہور بتوں ”اسات“ اور ”نامک“ کے درمیان زم زم کے چشمے کو بند کر دیا۔ پھر حوادث زمانہ سے یہ چشمہ دھب گیا۔ سینکڑوں سال بعد حضور اکرمؐ کے دادا عبدالمطلب کو خواب میں کنواں کھودنے کا حکم ہوا۔



دونوں اپنی بحث ادھوری چھوڑ کر اٹھ گئے۔ اگلی صبح دونوں اسکول کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئے۔ فروانے بیٹھتے ہی خوش ہو کر کہا: ”امی جی! میں نے رات خواب دیکھا کہ ابو میرے لیے بڑے پیارے پیارے کپڑے لائے ہیں۔“ اس پر فیروز ایک دم قہقہہ لگا کر بولا: ”واہ وا! جیسے ان کی بلی جھپٹڑوں کے خواب دیکھتی ہے، یہ کپڑوں کے خواب دیکھتی ہیں۔“

امی ابوانے یہ سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس لیے جب کوئی شخص اپنی دل پسند چیز کا شوق کرتا یا اسی کے بارے میں سوچتا ہے تو کہتے ہیں: ”بلی کے خواب میں جھپٹڑے ہی جھپٹڑے۔“



فیروز نے کمرے میں آتے ہی ”شی“ کی آواز نکالی اور ساتھ ہی پاؤں زور سے زمین پر مارا اور فروا کی پالتیلی روزی کو جگا کر باہر بھگا دیا۔ فروانے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی، بستر پر پٹخ دی اور چلائی: ”فیروز کے بچے! تم نے پھر آرام سے سوئی ہوئی روزی کو شکار کر بھگا دیا۔ میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے، تم مجھے بھی ہمیشہ اسی طرح ڈرا کر جگا دیتے ہو جب میں کوئی پیارا سا خواب دیکھ رہی ہوتی ہوں۔“ بہن کی اس بات پر فیروز ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا، جب کہ فروا لگا تار بولتی اور اسے ڈانٹتی رہی۔

”واہ بھئی واہ! تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے روزی بھی خواب دیکھ رہی تھی اور میں نے اس کا سہانا سپنا توڑ دیا ہو۔“ فیروز خوب ہنس لینے کے بعد بولا۔ ”ہاں تو کیوں نہیں..... کیا بلیاں خواب نہیں دیکھ سکتیں؟“ فروا یقین سے بولی۔ ”تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے روزی تمہیں خواب سنایا کرتی ہے۔“ فیروز نے اسے چڑایا۔ ”وہ سنا نہیں سکتی مگر میں تو سمجھ سکتی ہوں نا کہ وہ ضرور خواب دیکھتی ہے۔“ فروانے کہا۔

”بھلا تمہارے خیال میں وہ کیا خواب دیکھتی ہو گی؟“ فیروز نے مسکرا کر پوچھا۔ ”مثلاً..... وہ بہت سارے جھپٹڑوں کا خواب دیکھ سکتی ہے کیوں کہ اسے جھپٹڑے بہت پسند ہیں۔“

فیروز ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ ان کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور انہیں بتایا کہ ابو کھانے پر ان کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ



معافی مانگیں گے۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور گھر کا نظام چلانے کے لیے ملازمت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اپنے ایک رشتہ دار کی وساطت سے انہوں نے کچھری (عدالت) میں کام سیکھا اور پھر کچھ عرصہ بعد سر رشتہ دار (ریڈر، کورٹ کا ایک عہدہ) بن گئے۔ اس کے بعد وہ کمشنر کے دفتر میں منشی مقرر ہوئے۔ 1841ء میں انہیں فتح پور میں جج مقرر کیا گیا۔ جب جنگ آزادی برپا ہوئی تو اس وقت وہ بجنور میں ملازمت کر رہے تھے۔

اس جنگ کی ناکامی گویا مسلمانوں کی ناکامی تھی اور سب سے زیادہ عتاب کا شکار بھی مسلمان ہی ہوئے۔ ایسے وقت میں سر سید احمد خان جو کہ انگریزی حکومت کے ملازم تھے، انہوں نے کتاب ”اسباب بغاوت ہند“ لکھ کر انگریز سرکار کو جنگ کے اصلی حقائق سے آگاہ کیا۔ یہ ایک گستاخانہ حرکت بھی ہو سکتی تھی۔ ان کے ایک دوست نے انہیں اس کتاب کی اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے اس کام کو فرض جانا اور اسے مکمل کر کے ہی دم لیا۔

سر سید احمد خان کا ایک بڑا کارنامہ ہندوستان کے مایوس اور مظلوم مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب انگریزوں سے نفرت کے باعث انگریزی تعلیم کفر سمجھی جاتی ہو۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ انگریزوں اور

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی مسلمانوں کے لیے بے پناہ مصائب لے کر آئی۔ انگریز جس نے آہستہ آہستہ پورا ہندوستان اپنے قبضے میں لے لیا تھا، اس نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر جنگ آزادی کا خوب بدلہ مسلمانوں سے لیا۔ سرعام مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ کچھ کو توپ کے گولے کے ساتھ کھڑا کر کے شہید کیا گیا اور کئی کالا پانی (جزائر انڈیمان) پہنچے۔ ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کو جی اور جسمانی اذیت سے دوچار کیا گیا۔ الغرض ہندو اور انگریز، دونوں قوموں نے مسلمانوں کے لیے زندگی اجیرن کر دی۔

ایسے نازک دور میں، جب مسلمان خوف زدہ اور سخت مایوسی کا شکار ہو گئے تھے، سر سید احمد خان کی صورت میں انہیں ایک ایسا سیما ملا جو ان کے درد کا علاج بخوبی کر سکتا تھا۔

سر سید احمد خان کے ابتدائی حالات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں آنکھ کھولی۔ سخت مذہبی اور تربیتی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب گھر کا کوئی فرد ننگے سر کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بچپن میں ایک بار انہوں نے اپنے ملازم کو تھپڑ مار دیا۔ والدہ نے انہیں گھر سے نکال دیا اور واپسی کی شرط یہ ٹھہری کہ وہ ملازم سے

ہندوؤں کی غلامی سے آزادی کے لیے ہمیں تعلیمی میدان میں خود کو منوانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم اپنے دشمن انگریز کو ہندوستان سے باہر نکال کر ہندوؤں سے آزاد ہو سکیں گے۔ تقریباً 75 سال بعد دنیا نے دیکھا کہ سرسید احمد خان کی بات کتنی سچی تھی جب 1947ء میں مسلمانوں نے اپنا ایک علیحدہ ملک پاکستان حاصل کر لیا۔ یہ تعلیم، مقصد اور سچائی کی فتح تھی۔

عملی کام کا آغاز کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے 1875ء میں علی گڑھ میں ایم اے او اسکول قائم کیا جہاں عربی، فارسی، انگریزی، حساب، تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس اسکول کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے تھا۔ صرف دو سال بعد ہی اس اسکول کا درجہ بڑھا کر اسے کالج بنا دیا گیا۔ اب کالج کے معاملات چلانے کے فہرذ کی کمی محسوس ہوئی تو سرسید احمد خاں خود ہی چندہ جمع کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی انگریزوں سے قربت اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دلانے جیسے کام، مسلم مسلمانوں کے لیے قابل نفرت تھے۔ اس لیے چندہ جمع کرنے کے دھواں انہیں سخت جملے بھی سننے کو ملے مگر مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں سرخرو کرنے کا عزم ان سے سارے کام کراتا رہا اور وہ خوش خوشی تک بھی برداشت کرتے رہے۔ کالج کی ترقی کا عمل شروع ہوا تو یہاں سے تعلیم حاصل کر کے نکلنے والے مسلمانوں نے عملی زندگی میں وہ مقام حاصل کیا، جس کا تصور اس سے پہلے انگریزوں کے بنائے ہوئے اسکولوں کے طالب علموں تک محدود تھا۔

علی گڑھ کے اس کالج نے بعد میں یونیورسٹی کا درجہ بھی حاصل کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ہندوستان کے عظیم مقرر اور مسلمان کے رہ نما سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ یونین ہال میں تقریر کے آغاز سے قبل ادا کیا تھا:

”میں جب لاہور سے چلا تو احباب نے کہا کہ اگر علی گڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اگر پورے ہندوستان کے مسلمانوں سے کچھ کہنا ہے تو یونیورسٹی میں تقریر کرنا۔“

سرسید احمد خاں ہندوستان میں دو قومی نظریے کی وضاحت میں بھی پیش پیش تھے۔ جنگ آزادی کے بعد انہوں نے ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور یک جہتی برقرار رکھنے پر زور دیا،

مگر جب 1867ء میں بنارس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے رسم الخط اور زبان کو ختم کرنے کی کوشش کی تو سرسید احمد خان نے اسی دن کہہ دیا کہ اب مسلمانوں اور ہندوؤں کے راستے جدا جدا ہیں۔ سرسید احمد خان تصنیف و تالیف کے میدان میں سرگرم رہے۔ انہوں نے کتاب ”آثار الصنادید“ لکھی جس میں پرانی اور شکستہ تاریخی عمارتوں کا حال درج تھا۔ اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کتاب کے بعد رائل ایشیائی سوسائٹی لندن نے انہیں اپنا آنریری فیلو منتخب کیا۔

تاریخ کے حوالے سے بھی انہوں نے بے حد معیاری کام چھوڑا ہے۔ برائیکہ انگریز ولیم میور نے اپنی کتاب ”دی لائف آف محمد“ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور کتاب میں اعتراضات کیے مگر سرسید احمد خان نے اس کا جواب دینے کے لیے اپنا سارا اثاثہ فروخت کیا اور لندن پہنچے جہاں کے بڑے کتب خانوں میں وہ علمی مواد موجود تھا، جس سے وہ ولیم میور کے اعتراضات کا دلائل کے ساتھ جواب دے سکتے تھے۔ ان کے عزم اور ارادے کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے اپنے دوست نواب محسن الملک کو 20 اگست 1869ء کو لکھا:

”ان دنوں میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور نے جو کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں لکھی ہے، اس کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دلی جلا دیا ہے۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کہاں ہو گیا ہے۔ میں نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کہ کتاب لکھ دی ہے اور اگر تمام خرچہ ختم ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔“

ملت اسلامیہ کا یہ عظیم رہ نما اپنے حصے کا کام مکہ کے 17 مارچ 1897ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ ان کے انتقال کے 23 سال بعد ان کا خواب یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ 1920ء میں علی گڑھ کالج، یونیورسٹی بن گیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ قائد اعظم محمد علی جناح کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران کہا تھا: ”علی گڑھ یونیورسٹی مسلم لیگ کا اسلم خانہ ہے۔“

ڈاکٹر: ”بچے کو پانی دینے سے پہلے اہال لیا کریں۔“
 آدمی: ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اہال نے سے بچہ مرنے نہیں جائے گا۔“
 (عدن سجاد، جھنگ صدر)

ایک بچہ (دوسرے بچے سے): ”سورج کہاں سے لگتا ہے؟“
 دوسرا بچہ: ”مگر تم یہ سوال کسی بے وقوف سے پوچھو گے تو وہ بھی بتا دے گا۔“
 پہلا بچہ: ”اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ (فاطمہ نور، شیخوپورہ)
 ایک بچہ درخت کے ساتھ اٹنا لٹکا ہوا تھا۔ دادی نے پوچھا: ”بیٹا! درخت کے ساتھ اٹنے کیوں لٹکے ہو۔“ بچے نے جواب دیا: ”دادی سر درد کی (کوئی کھالی تھی، کہیں پیٹ میں نہ چلی جائے۔“

ایک دن میں دوستوں نے پکنک کا پروگرام طے کیا۔ پہلا بولا: ”میں ہم کا ٹوکرا لاؤں گا۔“ دوسرا بولا: ”میں بریانی پکوا کر لاؤں گا۔“ تیسرا بولا: ”میں اپنے چھوٹے بھائی کو لاؤں گا۔“ (مومنہ عامر، لاہور)

بچہ (مطمئن سے): ”تم نے اس شخص کو تھپڑ کیوں مارا؟“
 مطمئن: ”جناب! اس نے مجھے پچھلے مہینے گینڈا کہا تھا۔“
 بچہ: ”تو پچھلے مہینے کا تہہ لکھ کیوں نکالا؟“
 مطمئن: ”کیوں کہ میں نے کل ہی گینڈا دیکھا ہے۔“ (محمد صفی خان، پشاور)

باپ: ”ارے جاوید تم کیوں رو رہے ہو؟“
 جاوید: ”ماں صاحب نے مجھے سزا دی ہے۔“
 باپ: ”کس جلت پر؟“
 جاوید: ”اس لیے کہ میں یہ نہیں بتا سکا کہ ہالیہ کہاں ہے؟“
 باپ: ”آئندہ سے خیال رکھو، جو چیز جہاں رکھو یاد کر لیا کرو اور پوچھنے پر فوراً بتا دیا کرو۔“ (محمد عمیس خان، ڈیرہ غازی خان)

استاد جماعت میں آئے تو کسی کی کتاب گری پڑی تھی۔ استاد غصے سے بولے: ”یہ کس کی کتاب ہے؟“
 ”مولانا حالی کی۔“ ایک لڑکے نے جواب دیا۔ (علیہ عامر، فیصل آباد)

مریض (ڈاکٹر سے): ”آپ اتنے عرصے سے میرے دانت نکال رہے ہیں اور ہر بار غلط دانت نکال دیتے ہیں۔“
 ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”آپ فکر نہ کریں آج درست دانت نکال دوں گا کیوں کہ آپ کا صرف ایک ہی دانت باقی ہے۔“ (احمد عامر، فیصل آباد)

استاد (شاگرد سے): ”بتاؤ انگریزوں نے جب برصغیر میں پہلا قدم رکھا تو پھر انہوں نے کیا کیا؟“
 شاگرد: ”جناب انہوں نے دوسرا قدم رکھا۔“ (احمد عامر، فیصل آباد)



ایک دوست (دوسرے دوست سے): ”آج میں نے ایک بہت بڑے آدمی کی جیب کاٹی ہے۔“

دوسرا دوست: ”تمہیں کسی نے پکڑا نہیں؟“
 پہلا دوست: ”مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا کیوں کہ میں درزی ہوں۔“

(شاکلہ ناز، محمد شیخ، میانوالی)
 ایک دوست (دوسرے دوست سے): ”مجھے اپنا فون جسے کھوا دو۔“
 دوسرا دوست: ”ابھی میرے پاس ٹائم نہیں، فون کر کے پوچھ لینا۔“

☆
 استاد: ”بتاؤ! امریکہ کہاں ہے؟“
 شاگرد: ”جناب مجھے نہیں معلوم۔“
 استاد: ”تم ڈیسک پر کھڑے ہو جاؤ۔“
 شاگرد (کھڑے ہونے کے بعد): ”جناب! یہاں سے بھی نظر نہیں آ رہا۔“ (خدیجہ شجاعت، لاہور)

خریدار: ”کیا یہ کپڑا اوئی ہے؟“
 دکان دار: ”جی ہاں، بالکل اوئی ہے۔“
 خریدار: ”مگر اس پر لیبل تو سوتی لگا لگا ہوا ہے؟“
 دکان دار: ”جناب یہ تو جوہوں کو دھوکہ دینے کے لیے لگایا ہے۔“

☆
 پولیس انسپکٹر: ”تم نے لکپٹی کے میجر کا ہاتھ کیوں جلا دیا؟“
 نوجوان: ”سر! صاحب سے نوکری مانگنے گیا تو وہ بولے کہ پہلے میری مٹھی گرم کرو، تو میں نے جلتا ہوا کونڈا ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔“ (ماثرہ حنیف، بہاول پور)

استاد: ”بتاؤ وہ نہا رہے ہیں، میں نہا رہا ہوں، سب نہا رہے ہیں، یہ کون سا زمانہ ہے۔“
 شاگرد: ”جناب! یہ عید کا زمانہ ہے۔“ (محمد فاطمہ)

کھوج لگایے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔



سفیان ایک ذہین پولیس افسر تھا۔ وہ دورانِ تفتیش ہر چیز کو گہرائی سے سوچتا تھا۔ یہ شدید سردیوں کا موسم تھا۔ اس کی تعیناتی کوئٹہ میں ہوئی تھی۔ سردیوں میں کوئٹہ میں شدید برف باری کا موسم ہوتا ہے۔ سفیان اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھا۔ اچانک اسے اطلاع ملی کہ برف پوش پہاڑوں پر ایک مرد کی لاش پڑی ہے۔ سفیان نے فوراً اپنے ماتحت کو ساتھ لیا اور جائے واردات پر پہنچ گیا۔ سفیان نے دیکھا کہ کسی مرد کی لاش برف پر پڑی ہوئی ہے اور برف کے اوپر پاؤں کے نشانات کے ساتھ دو لائیں متوازی چل رہی ہیں۔ سفیان نے پاؤں اور لائنوں کو بہ غور دیکھا۔ کچھ دن بعد اس نے قاتل کا سراغ لگا لیا۔



پیارے بچو! آپ بتائیے سفیان نے قاتل کو کیسے تلاش کیا؟
ستمبر میں شائع ہونے والے ”کھوج لگایے“ کا صحیح جواب ”ٹاریل“ ہے۔

ستمبر 2015ء کے کھوج لگایے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

- 1- حافظہ مہدیہ آصف، گوجرانوالہ
- 2- تنسیم عبدالجلیل، راجہ جنگ
- 3- سعد زواد، پشاور
- 4- ارم اشرف، بھکر
- 5- عاشق علی کبودہ، پھول نگر



کو مصیبت آتی ہے۔“ یہ کہہ کر ایک پڑوسن کی طرف مڑیں اور بولیں۔ ”ہاں تو سروری، میں کیا کہہ رہی تھی؟ ارے ہاں! یاد آیا۔ اس موئے ماسٹر رحمت علی کا ذکر تھا۔ بہن اس کی مثل تو وہ ہے کہ ایتر کے گھر تیر، باہر باندھوں کہ بھیتر۔ اوجھے آدمی کو خدا پیسا دیتا ہے تو وہ اتراتا پھرتا ہے۔“

امی جان کی گاڑی نے پڑی بدلی تو ہم نے پھر کھیل شروع کر دیا۔ ”ہاں تو مہربان! دیکھئے۔ ہم نے اس لڑکی پر جادو کیا ہے۔ اب اس کا دماغ آئینے کے ماٹک ہو گیا ہے۔ ہم اس سے جو پوچھیں گا، یہ بالکل سچ سچ بتائیں گا۔“

یہ کہہ کر ہم سیما سے بولے۔ ”اے لکڑی..... آئی ایم سوری۔ اے لڑکی! بتاؤ کون؟“ سیما بولی۔ ”معمول۔“

ہم بولے۔ ”اور ہم کون؟“ بولی۔ ”نامعقول۔“

ہم نے اس کے پیر میں چنگی لی تو چیخ کر بولی۔ ”عالم، عالم۔“ ہم نے کہا۔ ”شاباش! اب بتا، جو پوچھیں گا، بتائیں گا؟“ وہ ناک میں بولی۔ ”بتائیں گا۔“

ہم بولے۔ ”جو کھلائیں گا وہ کھائیں گا۔“

بولی۔ ”جو تے نہیں کھائیں گا، باقی سب کچھ کھائیں گا۔“

ہم بولے۔ ”کھانے سے پہلے یہ بتا کہ یہ لڑکا کون ہے؟“

نکلنے گرمیوں کی ایک سہانی شام تھی۔ آنگن میں پلنگ پڑے تھے۔ امی جان اور خالہ جان پڑوسنوں کے جھرمٹ میں بیٹھی حسب دستور تیری میری برائیاں کر رہی تھیں۔ سب کے منہ میں پان ٹھنسنے تھے۔ ساتھ ہی سروتا بھی مدھرتا نہیں اڑا رہا تھا۔

نارنگی کے بیڑ کے پاس ہم محلے کے بچوں کو ”عالم معمول“ کا تماشا دکھا رہے تھے۔ ہم ”عالم“ تھے اور ہماری خالہ زاد بہن سیما ”معمول“۔ ہم ابا جان کی کالی اچکن پہنے ہوئے تھے اور ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا۔ ہم نے ڈنڈا سیما کے منہ کے سامنے لہرایا اور بولے۔ ”کالی مائی کلکتے والی، تیرا دار نہ جائے خالی۔ چھو۔ چھو۔“ اور سیما جھوٹ موٹ بے ہوش ہو کر پلنگ پر گر پڑی۔ ہم نے اس کے اوپر چادر ڈال دی اور بچوں سے بولے۔ ”دیکھئے صاحبان!“ کیا ہی کنڈل مار کے بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا۔ اب ہم آپ کو جادو کا کھیل دکھائیں گے مگر پہلے آپ سڑک چھوڑ کر چار قدم آگے آجائیں۔ ایسا نہ ہو پولیس والا چالان کر دے۔ ٹھیک ہے، اب بچے لوگ زور سے تالی بجائے۔

اور بچے لوگ نے اتنے زور سے تالیاں بجائیں کہ امی جان چیخ کر بولیں۔ ”اے بیٹے! کبھی تو چین سے بیٹھا کر۔ توبہ ہے! سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔ موٹی چھٹیاں کیا آتی ہیں، میری جان

بولی۔ ”آئی ایم سوری۔ آپ نے اتنی موٹی چادر اوڑھا دی ہے کہ ہم کو دکھائی نہیں دیتا۔ باریک چادر اوڑھائیے۔ پھر بتائیں گا۔“ سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہم نے کھڑے ہو کر سر کھجایا اور سوچنے لگے، بات کس طرح بنائیں کہ ایک دم گڑبڑ نہ ہو۔ ہمارا چھوٹا بھائی مسعود کمرے میں سے بھاگتا ہوا آیا۔ خوف کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آتے ہی چیخ مار کر پلنگ پر چڑھ گیا اور بولا ”گھک گھک گھک گھک۔“ تمام عورتیں گھبرا گئیں۔ امی دوڑی دوڑی آئیں اور بولیں۔ ”میرے لال! میرے جان! ماں صدقے، ماں قربان! بتا تو سہی کیا ہوا؟“

مسعود میاں آنکھیں اور منہ دونوں پھاڑ کر بولے۔ ”گھک گھک گھک گھک۔“

امی سر پیٹ کر بولیں۔ ”ہے ہے! کسی آفت بلا سے ڈر گیا ہے۔ اللہ کی امان، پیروں کا سایہ، دوست شاد، دشمن ناشاد۔ نیکی کا بول بالا، بدی کا منہ کالا، بسم اللہ الرحمن الرحیم..... یٰٰسین والقرآن الکریم.....“ خالہ جان بولیں۔ ”اے آبا، ہوش کے ناخن لو۔ یاسین تو مرتے وقت پڑھتے ہیں۔“ مسعود کی کھکھی بندھی ہوئی تھی۔ جب لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہ بتایا تو ہم نے لپک کر دو چپت رسید کیے۔ آپ منہ بسور کر بولے۔ ”مارتے کا ہے کو ہو؟ کہہ تو رہے ہیں کہ اندر کمرے میں سانپ ہے، کرسی کے نیچے۔“ سانپ کا نام سن کر تمام عورتوں کو سانپ سونگھ گیا اور ہم بھی بغلیں جھانکنے لگے، مگر پھر ذرا ہمت کی اور گدا صاف کر کے بولے۔ ”مگر آپ کمرے میں کیوں گئے تھے؟“

مسعود صاحب بولے۔ ”ہم الماری میں سے بسکٹ نکال رہے تھے۔“ یہ کہہ کر آپ نے سر کھجایا اور جلدی سے بولے۔ ”بسکٹ تھوڑی نکال رہے تھے، ہم تو..... ہم تو..... کیا نام اس کا.....“ بسکٹوں کا نام سنا تو امی سانپ کو تو گئیں بھول اور چیخ کر بولیں۔ ”گھر میں کوئی چیز آ جائے تو جب تک اسے کھاپی کر ختم نہ کر دیں یہ بچے تب تک مانتے تھوڑی ہیں۔ تو بہ ہے! ایسے بچے بھی میں نے.....“

خالہ جان بات کاٹ کر بولیں۔ ”اے آبا، بسکٹوں کو چھوڑو۔ سانپ کی فکر کرو۔“

امی گھبرا کر بولیں۔ ”ارے ہاں! جا تو سعید، بیٹھک میں سے ابا

جان کو بلا لا۔ کہنا محلے کے آٹھ دس آدمیوں کو بھی ساتھ لیتے آئیں۔“ اور ہم جا ہی رہے تھے کہ ابا جان موٹا سا ڈنڈا لے کر اندر آ گئے۔ کسی بچے نے انہیں پہلے ہی سے خبر کر دی تھی۔ پیچھے بچا جان بھی تھے۔ آگے آگے یہ دونوں، ان کے پیچھے امی اور خالہ جان اور ان کے پیچھے ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف کونے میں الماری تھی اور اس کے پاس ہی ایک کرسی رکھی تھی۔ برآمدے میں سے ہلکی ہلکی شنی اندر آ رہی تھی اور اس دھندلی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ کرسی کے نیچے ایک پتلا سا کالا سیاہ ٹانگ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ ہمیں غش آنے کو تھا کہ ابا جان نے آگے بڑھ کر کمرے کی بتی جلا دی۔ سارا کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔ امی جان نے اپنا وظیفہ شروع کر دیا۔ ”اللہ کی امان۔ پیروں کا سایہ۔“ ابا جان لائٹ ہاتھ میں پکڑے آہستہ آہستہ کرسی کی طرف بڑھے اور سانپ کو لائٹ میں لپیٹ کر اوپر اٹھالیا، مگر یہ کیسا سانپ تھا۔ نہ تو وہ تڑپا اور نہ اس نے بل کھایا۔ لائٹ کے ساتھ اس طرح چلا آیا جیسے رسی ہو۔ ابا جان نے اسے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بولے۔ ”لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو ازار بند ہے۔“

اب تو اتنے قہقہے پڑے کہ کان پڑی آواز نہ آئی۔ مسعود میاں جھینپ کر بولے۔ ”ہم نے دیکھا تھا تو یہ سانپ تھا۔ اب اس نے ہمیں بدل لیا ہے۔“ اس ہڑبونگ میں رات کافی گزر گئی تھی۔ محلے کی عورتیں ایک ایک کمرے کے چلی گئیں اور ہم سب اپنی اپنی چار پائیوں پر لیٹ گئے۔ امی تے زور کی جمائی لی اور بولیں۔ ”سعید میاں، تمہارے سر ہانے تپائی پر میں نے پانی کا جگ اور گلاس رکھ دیا ہے۔ رات کو پیاس لگے تو مجھے مت اٹھانا۔ ماشاء اللہ 12 سال کے ہو گئے ہو، ابھی تک ڈرتے ہو؟“

سیما کھوں کھوں کر کے ہنسی تو ہمیں بہت غصہ آیا۔ بولے: ”امی، میں ڈرتا تھوڑی ہوں۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ آپ کو بھی پیاس لگی ہوگی۔ جائیے! آج سے میں آپ کو نہیں اٹھاؤں گا۔“ ابا جان بولے۔ ”میرا بیٹا بڑا بہادر ہے۔“

”اور کیا.....“ ہم سینہ پھلا کر بولے۔ ”بڑا ہو کر میں تھانیدار بنوں گا اور سب سے پہلے سیما کو حوالات میں بند کروں گا۔“

سیما نے چادر تان لی اور بولی۔ ”تھانیدار نہیں تو جھدار تو ضرور بنو گے۔“ یہ کہہ کر ہنسی اور آہستہ سے بولی۔ ”بھگیوں کے۔“ ہم بھنا کر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے اور تڑخ کر بولے۔

”دیکھئے امی جان! اسے سمجھا لیجئے ورنہ۔“

ابا جان نے کہا۔ ”بس اب پانی پت کی چوٹی لڑائی شروع ہو جائے گی۔ چلو سہما، تم شمال کی طرف منہ کرو اور سعید میاں، تم جنوب کی طرف۔ اب کوئی بولا تو اس کی خیر نہیں۔ شب بخیر!“

ہم نے جواب دیا۔ ”شب بخیر!“ اور آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ اور..... آدھی رات کو سوئے۔

چونک اٹھے۔ بالکل چت لیٹے ہوئے تھے۔ چندا ماتموں کی صاف اور چمکیلی روشنی میں، نیند کی مانی، ادھ کھلی آنکھوں سے ہم نے دیکھا کہ ایک نہایت ہی کالی سیاہ، موٹی سی لمبی سی، چمکیلی سی چیز ہمارے سینے پر ریگ رہی ہے۔ پہلے تو سوچا کہ یوں ہی پڑے رہیں، لیکن وہ چیز، وہ کالی سیاہ اور چمکیلی سی چیز دھڑکے دھڑکے گردن کی طرف آرہی تھی۔ ہم نے زور سے نعرہ مارا مگر آواز حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی۔ آخر بڑی مشکل سے ہمت کی اور ایک دم اس کالی سیاہ، چمکیلی اور موٹی سی چیز کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور زور سے بولے۔ ”گھک گھک گھک گھک۔“

ہمارے پاس ہی امی جان اور خالہ جان کے پلنگے تھے اور کچھ دُور ابا جان سو رہے تھے۔ تینوں گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ امی نے ہمیں سینے

سے چمٹا لیا اور بولیں۔ ”کیا ہوا، میرے بیٹے! کیا ہوا میرے لال!“ ہم ہتاتے کیا خاک۔ ڈر کے مارے ہوش و حواس گم تھے۔ بس گھک گھک گھک گھک کیے جا رہے تھے۔ امی جان نے فوراً اپنا وظیفہ شروع کر دیا۔ ”اللہ کی امان، پیروں کا سایہ، دوست شاد، دشمن ناشاد.....“

ابا جان نے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”بولتا کیوں نہیں؟ آخر ہوا کیا؟ اور یہ سہما کی چٹیا کیوں پکڑ رکھی ہے؟ اسے تو چھوڑ۔“ سب لوگ پریشان تھے مگر سہما منہ میں دوپٹا ٹھونسنے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“ ابا جان جھلا کر بولے۔ ”اس کے ہاتھ میں سہما کی چٹیا کیسے آئی؟ اور آئی تو اس نے شور کیوں مچایا؟ اور شور مچایا تو اب خاموش کیوں نہیں ہوتا؟“

سہما بولی۔ ”خالو جان، میں بتاؤں؟ مگر پہلے بھائی جان کے ہاتھ سے میری چٹیا چھڑا دیجئے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔“

ابا جان نے ہماری مٹھیاں کھول کر اس کی چٹیا چھڑا دی۔ ہم ابھی تک آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے، ٹانگیں پھیلائے اور ہاتھ اٹھائے الو کی طرح گھورے جا رہے تھے۔

سہما بولی۔ ”بات یہ ہوئی خالو جان کہ مجھے لگی پیاس۔ میں پانی پینے کے لیے بھائی جان کے سرہانے آئی، گلاس میں پانی بھرا اور ان کی چارپائی پر بیٹھ کر پینے لگی۔ اتفاق سے میری چٹیا ان کے سینے پر پڑ گئی۔ یہ سب کچھ کہ سانپ ہے اور لگے کرنے گھک گھک گھک۔“

”لا حول ولا قوۃ.....“ ابا جان ہنسنے لگے۔

خالہ جان بولیں۔ ”بیٹی، تیری چٹا بھی تو دس گز لمبی ہے۔ تو بہا کیسے بال بچو، ہم نے کسی کے نہیں دیکھے۔ جا، اب جا کے سو جا۔“

صبح ہوئی تو ہم نے سہما کی خوشامد کی کہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ مگر یہ! وہ سہما ہی کیا جو مان جائے۔ اس نے سارے محلے کو یہ بات بھادوی اور ہوتے ہوتے ہمارے اسکول کے لڑکوں کو بھی ہماری بہادری کا یہ قصہ معلوم ہو گیا اور کئی مہینوں تک ہم شرم سے سر جھکائے جھکائے پھرے۔ ☆☆☆





بھی میں انگریزی کے حروف ابجد (A,B,C,D) ذہن نشین نہ کر سکا۔ تاہم سال کے ختم ہونے اور امتحانوں تک میں بنے نہ صرف پورے حروف ابجد ذہن نشین کر لیے بلکہ دنوں، مہینوں اور موسموں کے نام بھی یاد کر لیے اور میں چھٹی جماعت پاس کر کے ساتویں میں چلا گیا۔

میں خوش تھا کہ میں نے انگریزی پر ”عبور“ حاصل کر لیا ہے لیکن نئی جماعت میں ایک اور مسئلہ، ایک سنگین تر مسئلہ، انگریزی کی گرامر کا، سامنے آن کھڑا ہوا۔ اب ہمیں انگریزی کی کتاب پڑھنے کے ساتھ فعل (verb) صفت (adjective) اور زمانوں (tenses) کی پہچان کرائی جانے لگی لیکن اس میں میرے لیے سب سے مشکل کام زمانہ ماضی (Past Tense) کے لیے فعل (verb) کی دوسری اور تیسری فارم ذہن نشین کرنے کا تھا۔

اسکول کے بعد گھر پر، ہوم ورک پر لگنے والا تقریباً آدھا وقت verb کی دوسری اور تیسری فارم رٹنے پر خرچ ہو جاتا اور دہرانے پر، پھر یہ ادھر ادھر پھیل جاتے اور میں بے بسی اور لاچارگی کی تصویر بن کر رہ جاتا۔ نتیجتاً میرا آدھا خون حساب کے پیریڈ میں خشک ہو جاتا اور باقی کا نصف انگریزی کے پیریڈ میں۔ جوں ہی انگریزی

پاکستان بننے کے پندرہ بیس سال بعد تک ملک میں تعلیم کا ذریعہ سرکاری ادارے تھے۔ پرائمری تک تعلیم میونسپل کمیٹیوں کے اسکول مہیا کرتے تھے اور مل اور ہائی اسکول کی تعلیم ضلعی انتظامیہ کے تحت چلنے والے اسکولوں میں حاصل کی جاتی تھی۔

میں نے پانچویں جماعت تک تعلیم محلے کے پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ تعلیم کا سلیبس ملک کے طول و عرض میں ایک سا تھا اور ابتدائی جماعتوں میں اردو، دینیات، حساب، جغرافیہ اور تاریخ پڑھائی جاتی تھی۔

مجھے پڑھائی کا شوق تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا ذہن اتنا اچھا نہ تھا۔ باقی مضامین تو جیسے تیسے ہو رہے تھے، حساب میرے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ تقریباً روزانہ حساب کے پیریڈ میں میری شامت آئی رہتی اور میں چھٹی کے بعد سوال نہ آنے پر آنکھوں میں آنسو لیے کھر لوٹا۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد چھٹی جماعت کے لیے ہائی اسکول میں داخلہ لیا تو حساب کے ساتھ ایک اور مرحلہ درپیش ہوا۔ اب باقی مضامین کے ساتھ انگریزی بھی شامل ہو گئی۔ یہ میرے لیے ٹیڑھی کھر ثابت ہوئی اور تقریباً چھ ماہ گزرنے کے بعد

کے ماسٹر صاحب کلاس میں آتے ہیں حفظ کی ہوئی تمام دعاؤں کا ورد کرنے لگتا لیکن تاکہ۔

ایک روز وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ماسٹر صاحب نے آتے ہی verb کی دوسری اور تیسری فارم پوچھنا شروع کر دی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے یہ کام بائیں طرف سے شروع کیا اور میرا ڈیک سب سے آخر میں دائیں طرف آتا تھا۔ یوں مجھے کچھ یاد کرنے کا موقع مل گیا۔

ماسٹر صاحب نے ایک اور مہربانی یہ بھی فرمائی کہ verb کا چناؤ لڑکوں پر چھوڑ دیا لیکن شرط یہ تھی کہ ہر لڑکا ایک verb کی دوسری تیسری فارم بتائے گا، پہلے سے بتائے ہوئے کی نہیں۔ پہلے تو میں آخری ڈیک پر بیٹھنے کی خوشی منا رہا تھا لیکن اب مجھے اس کے نقصان کا بھی اندازہ ہوا کہ مجھے جتنے verbs کی دوسری تیسری فارمز آتی تھیں وہ سب مجھ سے پہلے بیٹھے لڑکے بتاتے جا رہے تھے۔ یا اللہ میرا کیا ہوگا؟

اب میں پیرید ختم ہونے کی دعائیں کرنے لگا لیکن یہ ختم ہونے کو نہ آ رہا تھا اور میری باری قریب آ رہی تھی۔ میرے پینے چھوٹنے لگے۔

میرے ڈیک سے پہلے ڈیک پر بیٹھے افضل اور ندیم کی باری آئی تو مجھے لگا کہ میرا دل سینے سے باہر آ رہا ہے۔ میں اسی وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ بس کلاس کا آخری لڑکا تھا اور میرے ساتھ صفدر بیٹھا تھا جو مجھ سے بھی زیادہ نالاٹ تھا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اس کے کان میں ہرگوشی کی۔ باری آنے پر وہ اعتماد سے اٹھا اور اس نے Good, Gooder, Goodest کہا۔ ساری کلاس کی ہنسی قہقہوں کا ایک طوفان اٹھا۔ میں نظریں نیچی کیے اپنی چال پر اترا رہا تھا۔ ہنسی اور ہونٹک کا طوفان تھا تو باری آنے پر میں Good, Better, Best کہہ کر کلاس پر یوں نظر دوڑائی جیسے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔

کلاس میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ماسٹر صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہمارے ڈیک تک آئے۔ انہوں نے دو ڈنڈے صفدر کو لگانے کے بعد مجھے ڈنڈے کھانے کے لیے ہاتھ آگے کرنے کو

کہا۔ ڈنڈے مجھے بھی پڑے کیوں کہ میں نے بھی verb کی دوسری تیسری فارم بتانے کی بجائے adjective کی comparative اور superlative فارم بتائی تھی۔ یعنی سوال گندم جواب جو۔ پٹائی تو ہوئی تھی۔

☆.....

پنجابی کی ایک مثل کا اردو میں ترجمہ کچھ یوں ہے کہ شوق یا مشغلے کے لیے اس پر آنے والا خرچہ بے معنی ہے۔ یعنی آپ کے دل میں کسی چیز کی خواہش یا شوق آپ کی جیب سے مطابقت رکھے، یہ ضروری نہیں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ میرے ساتھ بچپن میں ہوا۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ جہاں دو وقت کی روٹی بمشکل ہوتی تھی لیکن مجھے شوق ہوا تو فوٹو گرافی جیسے مہنگے مشغلے کا۔ اس شوق میں جیسے محلے کے دو دوست اور میرے ہم جماعت ارشد اور حامد بھی شامل تھے۔ فوٹو گرافی کے لیے پہلی ضرورت ایک کیمرے کی تھی اور ان وقتوں میں سب سے سستا کیمرہ پچاس روپے میں آتا تھا جو آج کے تقریباً دو ہزار روپے کے برابر تھا اور چوں کہ اتنی بڑی رقم ہمارے بس نہیں نہ تھی، میں اپنے شوق کو سینے میں دبائے کسی معجزے کا انتظار کرنے لگا۔

اور پھر یہ معجزہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد میں اپنے ایک عزیز کے گھر گیا تو مجھے ایک ڈبہ نما چوکور کیمرہ کوڈک نظر آیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اپنے شوق کا اظہار کر دیا۔ میرے عزیز نے کمال مہربانی سے مجھے وہ کیمرہ کچھ عرصے کے لیے دے دیا اور یوں مجھے اپنا دیرینہ شوق پورا کرنے کا موقع مل گیا۔

واپس گھر پہنچ کر میں نے وہ کیمرہ اپنے دونوں دوستوں کو دکھایا تو وہ بھی خوش ہوئے اور ہم نے پہلی فرصت میں اسے استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن اس کو استعمال کرنے کے لیے اس میں فلم لوڈ (load) کرانی تھی جس کی قیمت غالباً تین روپے تھی۔ ہم تینوں دوستوں نے جھوٹے سچے بہانوں سے اپنے اپنے گھروں سے یہ رقم اکٹھی کی اور فوٹو گرافر کی دکان سے کیمرہ لوڈ کرا لیا۔ کیمرہ لوڈ کرتے کے بعد فوٹو گرافر نے ہمیں بتایا کہ فلم میں سولہ

تصویریں تھیں اور جب یہ تعداد پوری ہو جائے تو ہم یہ فلم اس کے پاس لائیں گے تاکہ وہ اس کو دھو کر تصویریں نکال سکے۔

اتفاق سے اگلا دن اسکول سے چھٹی، یعنی اتوار کا تھا اور ہم نے وہ رات بہت بے چینی سے کاٹی کہ کب صبح ہو اور ہم اپنے شوق کی تکمیل کریں۔

اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہم تینوں دوست لوڈو کیمرہ کندھے سے لٹکائے، محلے کے جنوب میں کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور فضا میں جس تھا لیکن ہمارے شوق نے اس موسم کو بھی ہمارے لیے خوش گوار بنا دیا تھا۔

کھیتوں کے پتوں بیچ ایک بڑا سا جوہڑ تھا جس میں چھوٹے بڑے مینڈک تیرتے رہتے تھے۔ ہمیں یہ جوہڑ بڑا رومانٹک لگا اور ہم نے اس کے کنارے کھڑے ہو کر فوٹو گرافی کی ابتدا کرنے کی ٹھانی۔ سب سے پہلے میں جوہڑ کے کنارے بیٹھا اور مخالف سمت والے کنارے سے ارشد نے میری تصویر اتاری۔ اس کے بعد حامد کی باری تھی لیکن جب ارشد کی باری آئی تو وہ کنارے پر لڑکھا گیا اور جوہڑ میں جا گرا۔ اسے مشکلوں سے باہر نکالا کیوں کہ وہاں کافی پھسلن تھی اور وہ بلند بار جوہڑ میں پھسل جاتا تھا۔ اللہ اللہ کہ وہ کنارے تک آیا۔ اس کا پانچواں کچڑ میں لٹ پت ہو چکا تھا لیکن وہ فوٹو کھوانے پر مصر تھا۔ میں نے اس کی ”فرمائش“ کے مطابق ایک اور زاویے (اینگل) سے اس کی تصویر لی اور باقی تیرہ تصویریں کھینچنے کے لیے ہم آگے بڑھے۔

کچھ فاصلے پر سڑک تھی۔ وہاں ہمیں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ملا۔ ہم نے چرواہے کو کچھ دیر کے لیے اپنا ریوڑ روکنے کے لیے کہا تو وہ اس شرط پر راضی ہوا کہ ریوڑ کے ساتھ اس کی تصویر بھی لی جائے۔ ہم نے اس کی یہ شرط مانتے ہوئے تین چار تصویریں اتاریں اور باقی کی آٹھ فوٹو تصویریں اتارنے کے لیے کچھ فاصلے پر ایک آموں کے باغ کی طرف چلے۔

آموں کے باغ میں پہنچ کر ہم نے باغ کے رکھوالے سے اجازت مانگی تو وہ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں ہم فوٹو گرافی کے بہانے آم نہ توڑیں، پس و پیش کرنے لگے۔ اس کو آم نہ چرانے

کی یقین دہانی کرانے میں کافی منت سماجت کرنی پڑی۔ آخر وہ راضی ہوا تو ہم نے مختلف آم کے درختوں کے ساتھ کھڑے ہو کر چھ سات تصویریں اتار ڈالیں۔

آموں کے باغ کے باہر آئے تو ہمارے کیمرے میں ابھی تین چار تصویریں باقی تھیں لیکن ہمیں گھروں سے نکلے ہوئے دو تین گھنٹے گزر چکے تھے اور ہمیں بھوک کے ساتھ ساتھ گھروالوں کی ڈانٹ کی فکر بھی ستائے جا رہی تھی۔

سو ہم نے واپسی کی ٹھانی اور باقی کی تین چار تصویریں سڑک پر آنے جانے والے لوگوں کی کھینچ کر قلم پوری کر لی۔ اس کے بعد طے یہ پایا کہ کیمرہ حامد کے پاس رہے گا اور وہ اگلے دن بائیسکل پر فوٹو گرافی کی دکان پر قلم دھونے کے لیے دے آئے گا۔

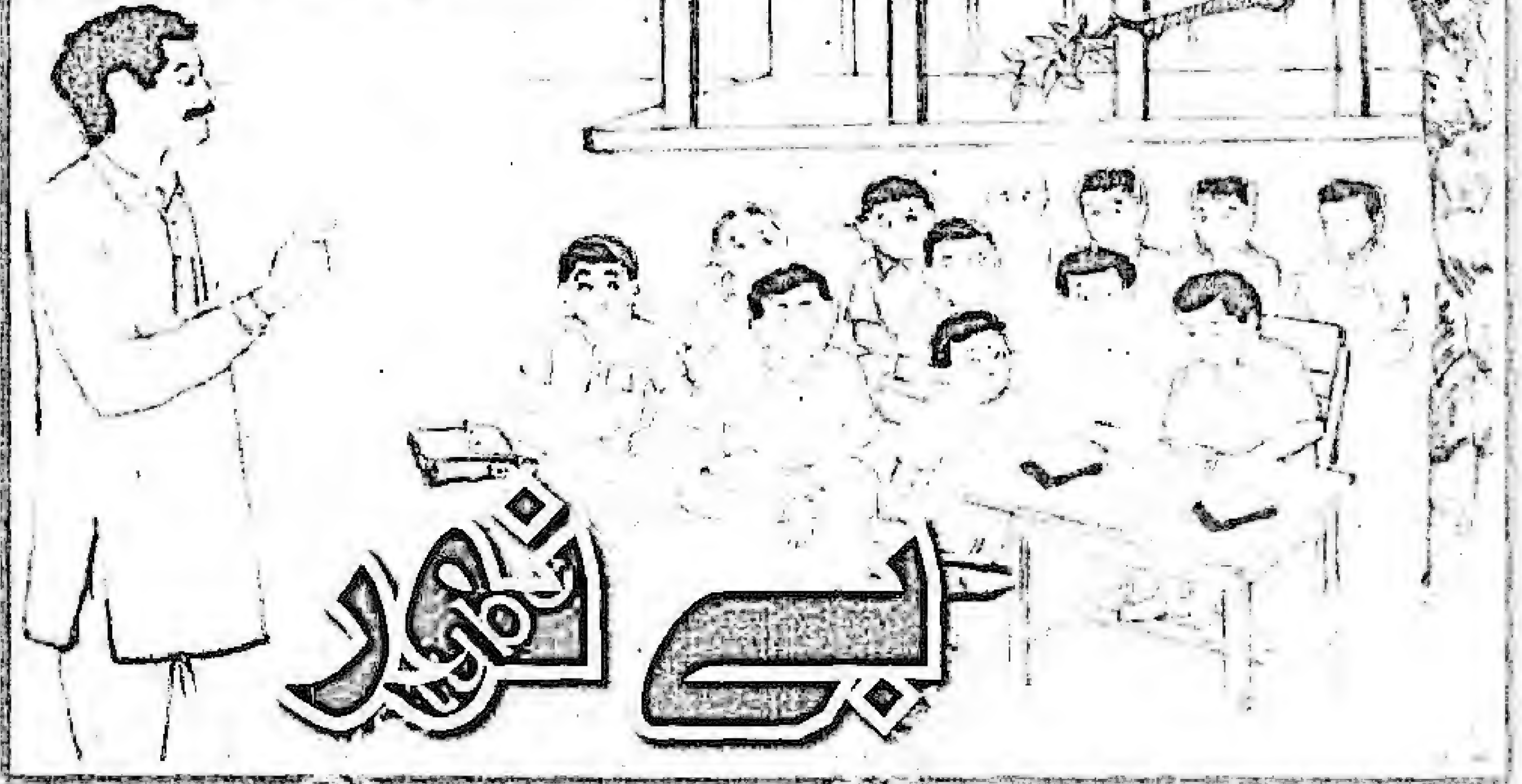
وہ رات ہماری مزید بے چینی میں گزری کیوں کہ ہم اپنی تصویریں دیکھنے کے لیے بے تاب ہوئے جاتے تھے۔

اگلی صبح دروازے پہ دستک ہوئی۔ باہر آیا تو حامد منہ لٹکائے ملا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ دیکھو۔ ہمیں قلم ہی غلط دی گئی ہے۔“ اور اس نے کرتے کی سائیڈ پاکٹ سے کچھ سمجھا ہوئی قلم نکال کر مجھے دکھائی۔ وہ ہم تینوں سے بے صبرا نکلا اور ”دھلائی“ کے پیسے بچانے کے لیے اس نے اسے نلکے (ہینڈ پمپ) پر دھو ڈالا تھا۔ ☆☆☆



سونف (Aniseed): ایک قسم کا دوائی پودا جس کی ادنیائی 2 سے 4 فٹ تک ہوتی ہے۔ پتے سوئیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ پھول مرکب قسم کے چھانٹا نما خوشنوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ پھولوں کا رنگ زرد اور پتھڑیوں کے سرے اندر کی طرف مڑے ہوتے ہیں۔ جنوبی یورپ کی پیداوار ہے لیکن اب انگلستان اور یوریشیا کے معتدل خطوں میں بھی کاشت کیا جاتا ہے۔ کاشت شدہ پودے کا پھل خوش بودار اور اس کا ذائقہ خوش گوار ہوتا ہے۔ اس کا عرق ہاضمے کے لیے مفید ہے۔ نرم نرم کوہلیں کھائی جاتی ہیں اور پھل (سونف) کھانوں کو خوش ذائقہ بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس پودے کی ایک قسم (Ferula Communis) ”ہیمرہ روم“ کے خطے کی پیداوار ہے جہاں اس کے تنے کی لکڑی بھی کام میں لائی جاتی ہے۔



کہ باقی سب بچے زمین پر بچے میلے ٹاٹ پر بیٹھے تھے۔ امیر باپ کی اولاد تھا لہذا اساتذہ نے اس کی بد تمیزیوں اور گستاخیوں کو نظر انداز کرنے میں ہی ہافیت جانی۔ اگر کوئی استاد گھر کا کام نہ کر کے لانے پر ڈانٹا بھی تو اس کو سبق سکھانے کے لیے نوکری سے ہٹوا دیا جاتا یا پھر اس کا تبادلہ ایسی جگہ کروا دیا جاتا کہ وہ عمر بھر یاد رکھتا۔ ان حالات میں رہتے ہوئے حمیر کا آٹھویں کے بعد ہی پڑھائی سے دل اچھاٹ ہو گیا، لہذا اس نے ضد شروع کر دی کہ اس نے اسکول نہیں جانا۔ بہت منت سماجت اور لاڈ پیار کر کے اسے شہر کے بڑے اسکول میں داخلے کے لیے رضامند کیا اور وہ بھی اس شرط پر کہ معقول جیب خرچ کے ساتھ ساتھ نیا موبائل فون اور گاڑی بھی لے کر دی جائے گی۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق، باپ کو اپنے لاڈلے کی خواہش پوری کرنی پڑی۔ قریب کے ایک ہوٹل میں رہائش کا بندوبست کر دیا گیا۔

سفارش اور ڈھیر سارے پیسے لے کر حمیر اور چوہدری صاحب شہر کے اسکول پہنچے تو اسے فوراً داخلہ مل گیا۔ گاؤں میں تو پھر گھر والوں کا خوف تھا مگر شہر آ کر تو اس کو کھلی چھٹی مل گئی تھی، لہذا مینے میں کبھی کبھار ہی اسکول کا رخ کرتا۔ ستم بالائے ستم دوست بھی دیے ہی نکلے ملے جیسا کہ وہ خود تھا۔ خوشامد کر کے اس سے پیسے ہوتے

چوہدری سریاب، گوٹھ سردار پور کا ایک بڑا سردار اور زمین دار تھا۔ شادی ہوئی تو بڑے عرصے بعد اللہ نے اندھیرے گھر کا چراغ، ایک بیٹا عطا کیا۔ وہ واجبی سی شکل و صورت کا تھا تو اکلوتا ہی اور وہ بھی اتنی منتوں مرادوں کے بعد ملا تھا۔ کبھی سردار جی کی بیگم منزہ پیدل چل کر بری امام کے مزار پر چادریں چڑھا کر آتی تو کبھی سردار جی خود جا کر موہڑہ شریف پر نیازیں بانٹ کر آتے۔ یہ تمام رسوم ان کے گاؤں میں نسل در نسل چلتی آرہی تھیں۔ فرزند کی پیدائش کے بعد ان چیزوں پر ان کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ بہر حال اس کی پیدائش پر مسلسل چالیس دن گاؤں میں شام کے وقت بتائے جاتے اور سولہ گوں کو کھانا کھلایا جاتا۔ بچے کا نام 'حمیر سریاب' رکھا گیا۔ بچہ ذرا سا کھانتا بھی تو ڈاکٹروں کی فوج ظفر موج چلی آتی۔ ہر قسم کی آسائش دے رکھی تھی۔ بتیس دانشوں میں سے نگلی ہوئی ہر خواہش پوری کر دی جاتی۔ ان حالات میں رہتے ہوئے موصوف کا بگڑ جانا روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ چھ سال کی عمر میں اسکول داخل کر دیا گیا۔ عمدہ قسم کی یونی فارم بنوائی گئی۔ پہلے دن نہایت ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ لاش پیش کرتی کار میں بیٹھ کر اسکول پہنچے تو تمام بچے حیرت و حسرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ ان کے لیے اسپیشل کرسی منگوائی گئی۔ سارا دن جناب کرسی پر گردن اکڑائے بیٹھے رہے حالانکہ

اور مفت میں اس کی گاڑی میں بیٹھ کے سیریں کرتے پھرتے۔ اس طرح پڑھتے ہوئے ٹیل ہو جانا کچھ عجب نہ تھا۔ دوست تو اس کے ٹیل ہونے سے بال بال بچے مگر موصوف خود سلی لے کر گھر واپس آ گئے۔ باپ نے کچھ کہنا چاہا مگر ماں سیدہ پلائی دیوار بن گئی۔ تھوڑی سی بے عزتی کے بعد اس کو ”چھٹی“ مل گئی۔ ٹیل ہونے سے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے اس نے آگے پڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ والدین کو بھی اس کی حالت زار کا اندازہ ہو گیا تھا، لہذا مزید اصرار کرنا انہوں نے مناسب نہ سمجھا۔

چند سال تو حمیر میاں نے خوب مزے سے گزارے مگر پھر ایک دن تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ بڑے مزے سے نرم گرم لحاف میں بیٹھے ڈرائی فروٹ کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک فون کی کھنٹی بجی اور اس کے موڈ کا ستیاناس کر گئی۔ اماں ابا تو کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ اس نے ملازم کو آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کھنٹی دوبارہ بجی تو غصے میں بڑبڑاتے ہوئے وہ اٹھا اور ریسپور کان پر لگایا۔ دوسری طرف کوئی خاتون کہہ رہی تھیں کہ اس کے والدین کا شہر سے واپسی پر ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے ہیں۔ یہ خبر سننے ہی اس کی دل خراش چیخ بلند ہوئی اور وہ وہیں ڈھل گیا۔ تمام نوکر چاکر بھاگے بھاگے اس کے کمرے میں پہنچے تو یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئے اور اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے کہ ایسے میں ایک نوکر کی نظر ٹیلی فون پر پڑی۔ اس نے ریسپور اٹھا کر کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ دوبارہ کھنٹی بج اٹھی۔ فون سننے پر پتا چلا کہ دونوں لاشیں اسپتال منتقل کر دی گئی ہیں۔ نوکر چاکر بھی یہ سن کر رنجیدہ ہو گئے۔ اس کے چچا کو فون ملایا گیا اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔

اس کے چچا فوراً اسپتال پہنچے اور ان کی لاشیں گھر لائی گئیں۔ حمیر کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ جنازے میں موجود ہر آنکھ اشک بار تھی۔ جب تک مہمان گھر میں موجود تھے تو سب ٹھیک رہا مگر کچھ دنوں بعد اس کے چچا اور چچی نے اپنے چہروں سے جھوٹی ہمدردی کا نقاب اتار پھینکا اور اس کے لیے روایتی چچا، چچی ثابت ہوئے۔

حمیر کو مدی طرح ڈرایا دھمکایا گیا کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کی خیر نہیں۔ وہ کون سا اتنا سمجھ دار تھا کہ ان کو منہ توڑ جواب دے پاتا، لہذا وہ فوراً ڈر گیا۔ اس نے اپنے تھوڑے سے کپڑے اٹھائے اور اپنا آئی فون اٹھایا جو کہ اسے اٹھارہویں سال گھر پر تحفہ ملا تھا۔ اس نے یہ کام نہایت احتیاط سے کیا کیوں کہ اگر اس کے چچا کو یہ پتا چل

جاتا تو اس کو اپنے موبائل سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔

یہ تمام سامان ایک گھڑی میں باندھ کر وہ باہر نکل پڑا۔ اس نے اپنے دوستوں کو تمام صورت حال سے فون پر آگاہ کیا مگر کوئی بھی اس کی مدد کو آگے نہ بڑھا۔ وہ خوشامدی مرغے جو سارا سارا دن اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے اور جن کی دوستی پر اسے فخر تھا، آج وہی دوست اس کے لیے انجان بن گئے تھے۔ وہ بہت افسردہ اور رنجیدہ تھا۔ ماں باپ کی اچانک موت، پھر اپنے سگے چچا کے گھر سے دھتکارے جانا اور پھر دوستوں کی بے وفائی..... سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔

وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا کہ کوئی اس کی مدد کو آگے بڑھتا، وہ تو انیس بیس سال کا نوجوان تھا اور وہ بھی ہٹا کٹا۔ جب دن ڈھلنے لگا تو اس کو بھوک محسوس ہوئی۔ وہ صبح کا بھوکا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے موبائل کو توڑ ڈالے جو اس کے کچھ کام نہ آیا تھا مگر اس کے علاوہ اس کے پاس تھا بھی کیا؟ اس نے اپنی جیبیں کھنگالی ان میں سے پچاس روپے برآمد ہوئے۔ اس وقت اسے وہ پچاس روپے بھی غنیمت معلوم ہو رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ڈھابے پر کھڑا تھا۔ اس نے دو روٹیوں اور ایک پلیٹ دال کا آرڈر دیا۔ چند ہی منٹوں بعد کھانا آ گیا۔

کہاں وہ فائو اسٹار ہوٹلوں کا کھانا اور کہاں وہ پتلی مرچیلی دال مگر اس وقت اسے وہ دال میکڈونلڈ کے برگر سے ہزاروں گے اچھی لگ رہی تھی۔ کھانا کھا کر وہ ڈھابے سے باہر آ گیا اور قریب ہی بنے ایک فٹ پاتھ پر لیٹ گیا جہاں چند بے گھر لوگ زمانے کی سختیوں سے بے پرواہ، نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ بھی ایک چادر بچھا کر ادھر لیٹ گیا۔

حمیر کے ذہن میں خیالوں کا ایک جھم برپا تھا۔ اس کو وہ وقت بُری طرح یاد آ رہا تھا جب وہ پانچ پانچ لاکھ کے چھوٹی پانچ پر لیٹا تھا اور اب وہ سینٹ کے فٹ پاتھ پر پڑا تھا۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب وہ نیند کی وادی میں کھو گیا۔ صبح کے وقت جب لکھ کے قریب سے ایک لش پش کرتی کار گزاری تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو بھی اپنا وقت یاد آ گیا جب وہ اپنے دوستوں کو گاڑی میں بٹھا کر سیریں کرواتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اپنی گھڑی اٹھا کر چل دیا۔

ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اسے سورج کی روشنی میں چمکتا مینار نظر آیا۔ وہ چلتا ہوا مسجد تک آیا اور جھپٹے اُتار کر وضو خانہ تک گیا اور اچھے طریقے سے وضو کر کے نماز ادا کرنے لگا۔ نماز کے

دوران حمیر سریاب خوب گزرا یا اور اللہ کے حضور اس نے رورو کر معافی مانگی۔ نماز کے بعد اس نے دو نوافل اپنے والدین کے ایصالِ ثواب کے لیے ادا کیے۔ وہ پہلی مرتبہ خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کے حضور پیش ہوا تھا ورنہ تو وہ صرف حید، بقرعید کے موقع پر ہی مسجد کا رخ کرتا تھا۔ اپنے دل کے محرم کے ساتھ غم بانٹ کر وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

نماز ادا کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ چلو امام مسجد سے مل لیا جائے۔ وہ اٹھا اور مولوی صاحب کے کمرے تک آیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے تلاوتِ قرآن کی آواز آرہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک ادھر کھڑا رہا تھا کہ ایک دم سے مولوی صاحب کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور انہوں نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ حمیر انہیں دیکھ کر چہرہ ان رہ گیا کیوں کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کے وہ ماسٹر صاحب تھے جن کو اس کے والد نے صرف اس لیے نوکری سے ہٹوایا تھا کہ انہوں نے اس کے لاڈلے کو ذرا سا ڈانٹ دیا تھا۔ ماسٹر جی خود بھی اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ قسمت ایک بار پھر انہیں آمنے سامنے لا کھڑا کرے گی۔ حمیر فوراً ان کے قدموں میں آ بیٹھا اور ان

سے رورو کر معافی مانگنے لگا۔ ماسٹر صاحب نے اسے سچے دل سے معاف کر دیا اور اس سے دریافت کیا کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے؟ جواباً اس نے ماسٹر جی کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس کی پتائیں کر وہ بھی آبدیدہ ہو گئے اور اسے تسلی دینے لگے۔

وہ اس کو اپنے گھر لے گئے جو کہ ان کو سرکاری طور پر ملا تھا کیوں کہ وہ ایک سرکاری مسجد میں اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ان کے گھر پہنچ گئے۔

گھر گیا تھا، بس ایک چھوٹا سا کمرہ، کچن اور باتھ روم پر مشتمل ایک چھوٹا سا کلا رٹ تھا۔ سرکار کی طرف سے ان کو تھوڑا بہت ماہانہ وظیفہ مل جاتا تھا جو ان کے لیے کافی تھا کیوں کہ نہ ہی ان کی کوئی اولاد تھی جب کہ اہلیہ بہت عرصہ پہلے ہی وفات پا چکی تھیں۔

ماسٹر صاحب نے اس کو کھانا کھلایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے ان کو اپنا موبائل فون دکھایا جو وہ بیچنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ان کو اپنی کلائی پر پہنا ہوا پلائٹیم بینڈ دکھایا جس کے اوپر پلائٹیم کی باریک تاروں سے 'حمیر' لکھا ہوا تھا۔ یہ اس کو فٹ ہال بیچ جیتنے پر اپنی ماں کی طرف سے تحفہ ملا تھا۔ ماسٹر جی شاہ کو اسے بازار لے گئے۔ خوش قسمتی سے اس کا موبائل تیس ہزار میں جب کہ



پلاٹینم بینڈ پندرہ ہزار میں بک گیا۔ یوں اس کے پاس 45 ہزار روپے ہو گئے۔ گھر واپس آتے آتے عشاء ہونے کو آئی۔ وہ فوراً رقم رکھ کر مسجد آ گئے۔ ماسٹر جی نے نماز پڑھائی اور حمیر نے ان کی امامت میں نماز ادا کی۔ اس کے بعد انہوں نے قرآن پاک کی تلاوت کی اور گھر آ کر سو گئے۔

تہجد کے وقت وہ پھر بیدار ہو کر مسجد پہنچے اور نماز ادا کی۔ تقریباً گھنٹے بعد وہ واپس کوارٹر آ پہنچے۔ اس نے ماسٹر جی سے پوچھا کہ وہ اس رقم کو کیسے استعمال میں لائے کیوں کہ بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جو بات اس کو بہت پہلے سمجھ جانی چاہیے تھی، وہ اس کی عقل میں اب آئی تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ بولے کہ وہ ایک چھوٹی سی دکان کھول لے جس میں بچوں کے کھانے والی گولیاں، ٹافیاں، پاپڑ، بسکٹ اور دیگر اشیاء ہوں۔ ماسٹر جی نے جج پر جانے کے لیے کافی رقم اکٹھی کی ہوئی تھی۔ انہوں نے وہ تمام جمع پونجی بھی اس کے حوالے کر دی۔ اب کل ملا کر ان کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے تھے۔ وہ ماسٹر صاحب کا بے حد مشکور تھا۔

قریب ہی ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی دکان برائے فروخت تھی۔ انہوں نے دکان کے مالک سے رابطہ کیا اور اس سے ملاقات کی۔ مالک، جس کا نام عباس تھا، ڈیڑھ لاکھ میں دکان بیچ رہا تھا مگر ان کی مجبوری سن کر سوا لاکھ میں راضی ہو گیا۔ اس روز تو وہ رقم ساتھ نہیں لائے تھے، لہذا انیس تاریخ کو پیسے دینے کا وعدہ کر کے وہ واپس آ گئے۔ ماسٹر جی نے انیس تاریخ کو ایک نکاح پڑھوانے جانا تھا، لہذا وہ اس کے ساتھ نہیں جاسکتے تھے۔ اب اس کو اکیلے ہی عباس کے پاس جانا تھا۔ شام کے وقت وہ رقم دینے کے لیے چل پڑا۔ اس نے رقم نہایت احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ خراماں خراماں چل رہا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مسلسل اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

ابھی وہ تھوڑا آگے ہی گیا تھا کہ کہیں سے دو ملنگ قسم کے آدمی اس کے پاس آئے۔ بے لے سلک کے چننے پہنے ہوئے، گلے میں لمبی لمبی مالائیں لٹکائے ہوئے، وہ دونوں خاصے بھیا تک لگ رہے تھے۔ ایک بابا بولنے لگا: ”بچہ ہمیں معلوم ہے کہ تو مصیبتوں کا ستایا ہوا ہے اور تیرے پاس جو رقم ہے وہ بہت تھوڑی ہے۔“ حمیر تو بابا جی کا ’ناج‘ دیکھ کر حیران رہ گیا اور نہایت معصومیت سے کہنے لگا: ”اچھا، اگر آپ کو یہ سب پتا ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہو گا کہ میرے

والدین بھی فوت ہو چکے ہیں۔“

بابا جی کہنے لگے: ”ہاں بچہ ہاں! بابا سب جانتا ہے اسی لیے تو تیری مدد کو آیا ہے۔“

حمیر میاں تو بچپن سے ہی پیروں فقیروں کے پاس بجاتا رہا تھا لہذا وہ ان نوسربازوں کی ’کاملت‘ پر ایمان لے آیا تھا۔ پھر بابا کہنے لگا کہ اگر وہ اپنے والدین سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے دس منٹ تک بالکل ساکن کھڑا رہے تو وہ ”دوسرے جہان“ پہنچ جائے گا اور جب تک وہ اپنے والدین سے ملاقات کرے گا، پیچھے سے بابا صاحب اس کے پیسے ڈگنے کر دیں گے۔

وہ باسانی مان گیا۔ وہ تو گاؤں کے اسکول کا آٹھ جماعتیں قبل تھا، بھلا اس ان پڑھ، جاہل کو کیا معلوم تھا کہ کوئی عام آدمی اس کو ایسی جگہ کیسے لے جاسکتا تھا مگر اس وقت اس کو کون سمجھانے آتا۔ اس نے فوراً اپنے پیسے بابا لوگوں کے حوالے کیے اور آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہر شخص اسے دیکھ کر ہنس رہا تھا مگر وہ تو کسی اور ہی دنیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

کافی دیر تک وہ یوں ہی کھڑا رہا۔ بالآخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر اسے وہ دونوں ملنگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ اسے ایک شخص نظر آیا۔ اس نے اس آدمی کو ساری بات بتائی تو وہ بے اختیار ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ ”ارے بھولے بادشاہ! گلتا ہے پہلی بار گھر سے نکلے ہو یا مکتب سے اتنا بھی نہیں سیکھا کہ کھولے کمرے کی تمیز کر سکو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ سڑکوں پر ایسے ٹھگ تم جیسے ہی بے وقوف لوگوں کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے تو نہایت حیرت ہو رہی ہے۔ بہر حال اب جو خدا کو منظور تمہاری کم علمی ہی تمہارے آگے آئی ہے، لہذا گھر کا رستہ ناپو اور آئندہ احتیاط کرنا۔“

اس کی دنیا ایک بار پھر اندھیر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں نوسرباز اس کا سب کچھ لے گئے تھے مگر اسے یہ احساس دلا گئے تھے کہ اس کے بچپن کی محرومی جس کا ذمہ دار وہ بذات خود تھا، آج اس کے سامنے آ گئی تھی۔ کاش وہ علم اور تجربے کی راہ اپناتا تو آج اس مقام پہ نہ ہوتا۔

اب وہ پھر اپنا سر پکڑے فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔ وہ علم کے نور سے باسانی استفادہ حاصل کر سکتا تھا مگر وہ بے نور ہی رہا۔

☆☆☆

سلام پیش کرتے ہیں لیکن وہاں بھی میری آواز ان تک نہیں پہنچتی۔ وہ اپنے حالات پر روتے ہیں، اپنے حکمرانوں کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن اپنی غلطیوں سے غافل ہیں۔

یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہی ہیں جو مجھے بناتے ہیں، مجھے لہراتے ہیں۔ یہ سب مجھے لہرانے والے ہی ہیں۔

پھر جب یہ کوئی عظیم کام سرانجام دے کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو انہیں مجھ سے لپیٹا جاتا ہے اور شاید تب وہ مجھے سن لیتے ہوں لیکن تب کیا فائدہ؟ سب سے زیادہ تکلیف مجھے آزادی کے موقع پر ہوتی ہے جب ہر جگہ موجود ہوتے ہوئے بھی میں ان تک اپنی آواز نہیں پہنچا پاتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ یہ مجھے بے شک نہ لہرائیں، اپنے سینے پر نہ لگائیں۔ اپنی دفتروں کی میزوں پر مجھے نہ رکھیں۔ مجھے سلامی پیش نہ کریں۔ صرف مجھے دیکھیں اور مجھے سنیں اور جانیں کہ مجھے لہرانے کا مقصد کیا ہے اور میں ان سے کیا چاہتا ہوں؟ بس یہی میری آرزو ہے۔

میرے عزیز ہم وطنو! میرے وجود کا مقصد مجھے لہرانا نہیں ہے بلکہ میرے اوپر موجود چاند اور تارے کو دیکھنا اور سمجھنا ہے اور اس غریب بچے کی طرح ستاروں کو دیکھنے سے تم ستاروں تک نہیں پہنچ سکو گے بلکہ مجھے دیکھنے اور سننے اور میری بات پر عمل کرنے سے تم ستاروں سے بھی آگے جا نکلو گے جیسا کہ اقبال نے کہا تھا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

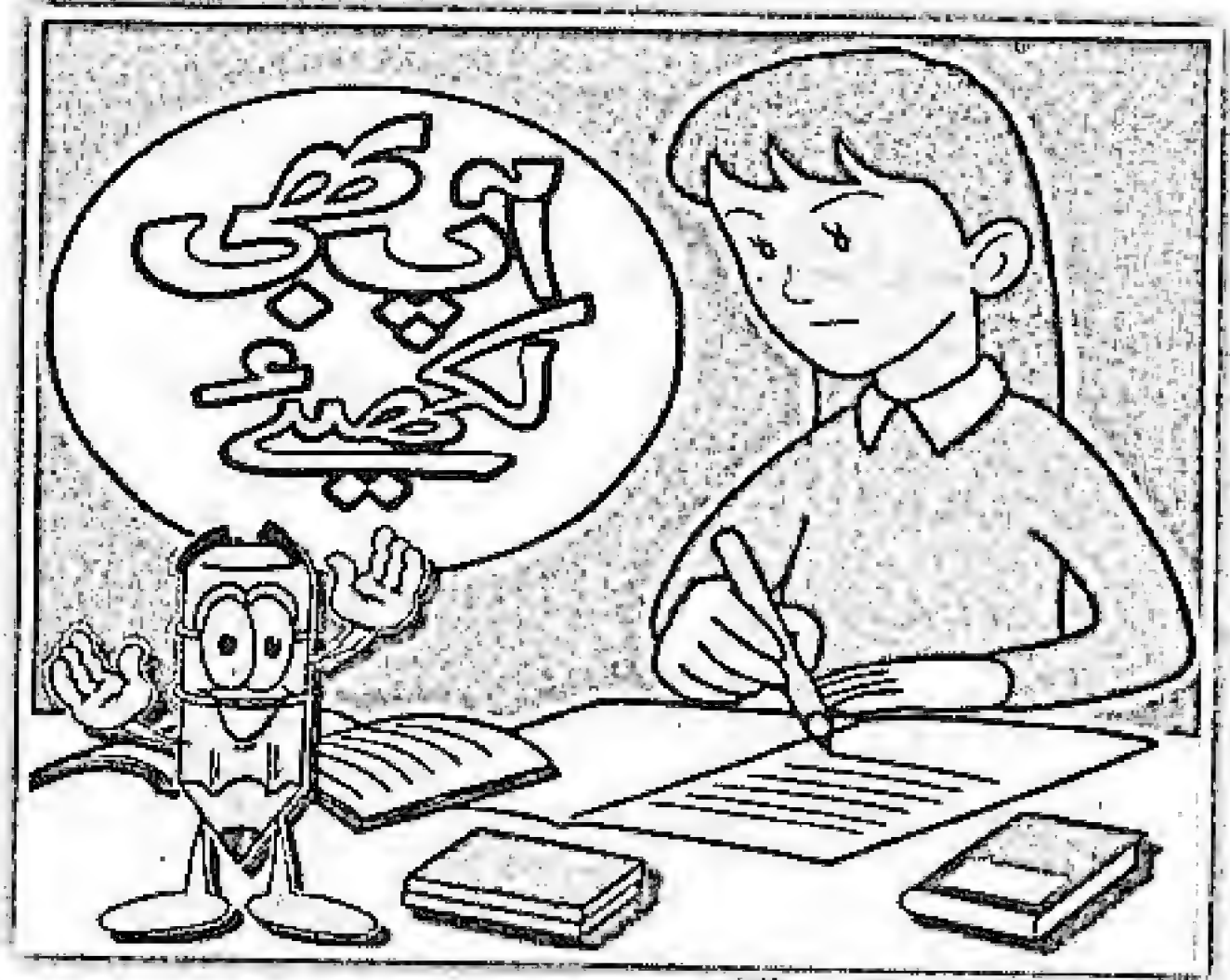
لیکن جلدی کرنا! اس سے پہلے کہ میری آواز بند ہو جائے اور پھر تم چاہ کر بھی مجھے نہ دیکھ سکو۔ (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

وہ ایک سبق

(محمد اسحاق مٹھرا، پشاور)

”ہاں پیارے بچو! آج کا سبق غور سے سنو!“ میں نے حاضری لینے کے بعد سبق پڑھانا شروع کیا۔ ”اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنے بے شمار انعامات فرمائے ہیں۔ ہماری جان بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، بلکہ یہ ہمارے پاس اس کی امانت ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے، کیوں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم نعمت ضائع ہو جاتی ہے۔“

یہاں تک پہنچ کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بے اختیار میرے سامنے ماضی کے صفحات پلٹتے چلے گئے اور نوجوانی کے دھوکے کا



مجھے لہرانے والے

(ایمان یاسر، سیالکوٹ)

آج پھر وہ لڑکا اپنے گھر سے نکلا، اسی کام کے ارادے سے جو وہ روز کرتا تھا۔ صبح اپنے محلے کی ایک دکان پر جاتا اور پھر وہی پُرانا کام جو اس کی عمر کے کئی اور لڑکے کرتے تھے۔ میں روز اسی لڑکے کے گھر کی چھت سے یہ سب دیکھتا ہوں۔ کل رات اس کا باپ اسے کم پیسے لانے کی وجہ سے ڈانٹ رہا تھا۔ اسے تو رات کا کھانا بھی نہ ملا اور وہ سخت سردی میں چھت پر سویا تھا۔ میں ساری رات اسے دیکھتا رہا، اسے پکارتا رہا مگر وہ تو آسمان پر ستاروں کو ہی دیکھتا رہا۔

ایک تقریب میں مجھے لہرایا تھا، لیکن پھر بھی میں نے ان کا اسکول دیکھا۔ یقیناً ان کے ماں باپ کی ساری کمائی ان کو پڑھانے میں ہی خرچ ہو جاتی ہوگی۔ میں روز سوچتا لیکن کچھ دن پہلے میری سوچ بدل گئی تھی جب میں نے دفتر میں بیٹھے ان کے والدین کو دیکھا۔ انہوں نے مجھے اپنی میز پر رکھا ہوا ہے لیکن وہ مجھے کبھی نہیں سوکھتے۔ وہ تو شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ وہ لوگ تو ناجائز کمائی سے اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔

کچھ ہی دن پہلے ملک کے ہر گھر میں انہوں نے مجھے لہرایا تھا لیکن مجھے لہرانے کا مقصد نہیں جان سکا۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان زندگی گزارتا ہے لیکن اپنی زندگی گزارنے کے مقصد پر غور نہیں کرتا۔

وہ مجھے اپنے دفتروں میں رکھتے ہیں لیکن کام چوری اور بددیانتی کے وقت میں انہیں نظر نہیں آتا۔ وہ مجھے اپنے اسکولوں میں لہراتے ہیں لیکن پھر بھی میری آواز ان تک نہیں پہنچتی۔ وہ سنتے ہی نہیں ہیں کہ میں کیا کہتا ہوں، کیا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ وہ مجھے سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ مجھے اپنے سینے پر لگاتے ہیں، مجھے

المناک واقعہ اور ماسٹر عنایت کی نصیحت کی ویڈیو میرے ذہن کی اسکرین پر تیزی سے چلنے لگی۔

”بس یار، میں نے تو آج فیصلہ کر لیا ہے۔“ امجد عثمان کہنے لگا۔
میں نے پوچھا۔ ”کیا ابو نے وعدہ پورا کرنے سے انکار کر دیا ہے؟“
”وہ تو بس یوں ہی مجھے ٹر خا دیتے ہیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے،
نہیں خریدنی انہوں نے میرے لیے بانیک۔ آج ان کو میری قدر
معلوم ہو جائے گی۔“ وہ بولا۔ ”اور کیا تمہارے ابو نے تمہیں سچ
اسکرین موبائل لا کر دیا؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”انہوں نے ایک مہینے کی مہلت
مانگ لی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ ایک مہینہ بعد ضرور لا کر دیں گے۔“
”چھوڑو یار، ہم نے پانچویں کلاس میں بھی کتنی محنت کی، کھیل کود
چھوڑا، اپنی نیند برباد کی، دن رات ایک کر کے پہلی اور دوسری پوزیشن
حاصل کی۔ صرف اس لیے کہ یہ لوگ وعدے کر کے پھر ٹال مٹول کریں۔
نہیں چاہیے مجھے ایسی زندگی۔“ وہ انتہائی جذباتی ہو چکا تھا کیوں
کہ اس کے ساتھ کیے گئے وعدے ابھی تک وفا نہیں کیے گئے تھے۔
میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دیکھو امجد! یہ بہت بڑا
قدم اٹھانے تم جا رہے ہو۔ تمہیں پتا ہے تمہارے والدین۔“

”تو کیا نہیں رہا نا تم نے میرے ساتھ اس راستے پر؟“ امجد
بات کاٹتے ہوئے فوراً بول پڑا۔ ”بس بھئی، مجھ سے تو اور برداشت
نہیں ہو رہا۔ میں نے تو جیسے بھی ہو، آج یہ کام کرنا ہی ہے۔“
”آج ہم نے انہیں یہ احساس دلانا ہی ہے۔“ اور پھر وہ اپنے
ساتھ مجھے بھی یہ بھیا تک قدم اٹھانے پر اکسانے لگا اور بالآخر وہ
مجھے تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ چلچلاتی دھوپ اور سورج بھی آگ کے شعلے
برسا رہا تھا۔ ہم دونوں ایک مذموم عزم لیے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے
ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ہمیں دُور سے اپنی منزل
نظر آنے لگی۔ ہاں! ویرانی اور گہری خاموشی میں ہمیں ریل کی پٹری
نظر آنے لگی۔ ٹرین کے گزرنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ہر طرف
ہو کا عالم تھا۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔

ہم پٹری کے قریب کھڑے ہو گئے۔ اچانک مجھے ایک جھٹکا سا
لگا۔ مجھے دو دن پہلے پڑھا ہوا اسلامیات کا سبق ”خودکشی“ یاد آیا۔
ہمیں اسلامیات ماسٹر عنایت پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی میٹھی اور

پر شفقت آواز میرے ذہن میں گونجنے لگی۔

اس خیال سے میرے جسم میں جیسے کرنٹ سی لگ گئی ہو۔ اچانک
میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس دوران ٹرین انتہائی قریب آ چکی تھی۔ میں نے
جلدی سے ہاتھ بڑھا کر امجد کو بھی پیچھے کھینچنے کی کوشش کی لیکن بے سود،
اس دوران وہ لقمہ اجل بن چکا تھا۔ ٹرین اس کے اوپر سے گزر چکی
تھی۔ وہ اپنے مذموم عزم کو عملی جامہ پہنا چکا تھا جب کہ مجھے ذات
خداوندی نے اپنے فضل و کرم سے بچا لیا تھا۔

پھر وہ منظر بھی میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا کہ جب اس
کی کچلی ہوئی لاش لائی گئی تو اس کے گھر کھرام مچ گیا۔ اس کی ماں زار و
قطار رونے لگی۔ اس کا باپ بار بار اسے بانیک دلانے کا اعلان کر رہا تھا
لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

”ایکسیکوز می سرا! آپ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے ہیں۔“ میں
انہی ماضی کی سوچوں میں غرق تھا کہ پراکٹر کی آواز نے مجھے چونکا
دیا۔ اچانک میں اپنے خیالات کی دُنیا سے باہر آ گیا۔

”شکر ہے تیرا یارب! تو نے اپنے فضل سے میری حفاظت
فرمائی۔“ بے اختیار میرا دل تشکر کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔
”کاش! میرے ساتھ میرا دوست امجد عثمان بھی اس دن یہ سبق یاد کر
لیتا۔“ میں نے ایک سرد آہ بھری۔

پوری کلاس میری طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا
کہ کیوں نہ آج میں انہیں بھی یہ عظیم درس دوں اور یہ خیر کا سلسلہ
جاری رکھوں تاکہ آنے والی نسلیں بھی اس غلط راستے پر چلنے سے
محفوظ ہو سکیں۔ میں گویا ہوا: ”ہاں بیٹا! خودکشی بہت بڑا گناہ ہے۔ بیٹا،
وعدہ کرو کہ زندگی میں بھی اس عظیم گناہ کا ارتکاب نہیں کرو گے۔“
”نو سرا!“ ”وعدہ ہے؟ پکا وعدہ؟“ ”لیس سر۔“ سب نے یک زبان
ہو کر کہا۔ البتہ آج میں نے صرف اس قدر اضافہ بھی کیا:

”اور بیٹا! یہ سبق آگے بھی پہنچانے کی کوشش کرو گے نا۔“

”لیس سر، لیس سر، انشاء اللہ!“ پوری کلاس نے یک زبان ہو کر
کہا اور میں کلاس سے باہر نکلتے ہوئے دل میں کافی اطمینان محسوس کر
رہا تھا۔ (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

(ربیعہ اور لیس مغل، گوجرانوالہ)

صحت کی حفاظت

حسن کے پیٹ میں درد تھا، وہ درد کی شدت سے لوٹ پوٹ ہو رہا
تھا۔ اس سے پہلے کہ امی جان اسے دوا دیتی، ماموں جان آ گئے۔ وہ

گئے۔ حسن جلدی سے بولا۔ ”میں آپ کی نصیحت پر ضرور عمل کروں گا اور نبی کریم کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی پوری کوشش کروں گا۔“

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

کمپیوٹر گیمز اور اس کا نقصان

(محمد جنید ناگرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

عبداللہ معمول کے مطابق اٹھا اور کچھ کھائے پیئے بغیر کمپیوٹر پر گیمز کھیلنے لگا۔ عبداللہ ایک مختصر بچہ تھا، اس بار دوم پوزیشن لینے پر اس کے والد نے عبداللہ کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کیا اور اسے اعلیٰ قسم کا کمپیوٹر لے دیا۔ اسکول سے چھٹیاں ہو گئی تھیں اور چھٹیوں کے ساتھ عبداللہ کا معمول بالکل بدل گیا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے اٹھتا اور کمپیوٹر آن کر کے گیمز کھیلنے شروع ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد اس کے دو دوست حسن اور حسین بھی آ گئے اور عبداللہ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ وہ تینوں دوست گیمز کھیلنے میں محو ہو گئے۔ یہ عبداللہ کا روزانہ کا معمول تھا۔ آج بھی وہ تینوں کمپیوٹر کے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ عبداللہ کا سر چکرانے لگا اور اسے تے آنا شروع ہو گئی۔ یہ سب اچانک ہوا تھا۔ جب اس کی امی نے عبداللہ کی یہ حالت دیکھی تو اسے ایک پلنگ پر لٹا دیا اور اسے دبائے لگیں۔ آہستہ آہستہ سب گھر والے عبداللہ کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے اور اس سے وجہ دریافت کرنے لگے لیکن عبداللہ کی حالت شدید بگڑ گئی اور اس کے سر میں بھی شدید درد ہو رہا تھا۔ اتنے میں عبداللہ کا بھائی ڈاکٹر صاحب کو لے کر آ گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن وغیرہ لگا کر اس کی بگڑتی حالت کو کنٹرول کیا۔ جب عبداللہ کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو ڈاکٹر نے عبداللہ سے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔ عبداللہ نے سب کچھ بتایا تو ڈاکٹر نے عبداللہ کے والد کو بتایا کہ لگاتار کمپیوٹر کے استعمال نے اس کے جسم کو بہت کمزور کر دیا ہے، اس کو آرام کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر گیمز نے اس کے دماغ پر بہت گہرا اثر کیا۔ بہر حال عبداللہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ عبداللہ نے بھی وعدہ کیا کہ اب وہ زیادہ وقت پڑھائی پر صرف کرے گا اور اچھی اچھی اور مفید کہانیاں اور کتابیں پڑھے گا اور اپنے دوستوں کو بھی ضرورت سے زیادہ کمپیوٹر کے استعمال سے دور رہنے کی تلقین کرے گا۔ سب گھر والوں کو بہت خوشی ہوئی۔ سب عبداللہ کے اس وعدے سے بڑے خوش ہوئے۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

ڈاکٹر تھے پہلے وہ حسن کی حالت دیکھ کر پریشان ہوئے، پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ سارا درد کھانے کی وجہ سے ہے تو وہ مسکرانے لگے۔ حسن اپنا درد بھول کر تارنگی سے بولا۔ ”ماموں جان! میرا درد سے برا حال ہے اور آپ ہنس رہے ہیں۔“ ماموں جان بولے۔ ”بیٹے، میں اس لیے ہنس رہا ہوں کہ آپ نے خود ہی بیماری کو دعوت دی ہے۔ کہتے ہیں پیٹو اپنی مصیبت کا سبب خود ہوتا ہے۔ زیادہ کھا کر وہ اپنی صحت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ عادت اسے بیمار کر دیتی ہے، تم نے بھی اپنا ایسا ہی حال کیا ہے۔“ حسن شرمندہ سا ہو گیا۔ ماموں بولے۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ کھانا عام طور پر دن میں تین مرتبہ کھایا جاتا ہے۔ تم کام سے فارغ ہوتے ہی کبھی چپس کھانا شروع کر دیتے ہو، کبھی سموسے، کبھی برگر اور کبھی دی بھلے کھاتے نظر آتے۔ دود، گولی، ٹانی اور چیونگم تو ہر وقت تمہاری جیب میں ہوتی ہے۔ تمہارے پیٹ میں درد کیوں نہ ہو؟“ حسن کے پاس ماموں کی کئی باتوں کا جواب نہ تھا۔ ماموں جان نے اسے دوا دی اور بستر پر لیٹ کر آرام کرنے کے لیے کہا۔ جب اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو ماموں جان نے کہا۔ ”حسن! میں آپ کو اہم واقعہ سناتا چاہتا ہوں۔“ حسن ماموں کی طرف دیکھنے لگا۔ ماموں جان بولے۔ ”بیٹا! ایک بار ایک بادشاہ نے پیارے نبی کی خدمت میں ایک حکیم کو بھیجا کہ جب ضرورت پڑے تو مسلمانوں کا علاج کیا جائے۔ وہ حکیم کافی عرصے تک مدینے میں رہا مگر اس دوران کوئی شخص بھی دوا لینے کے لیے اس کے پاس نہ آیا۔ اس بات پر وہ حکیم بڑا حیران ہوا۔ نبی کریم نے فرمایا: ”یہاں لوگ بیمار نہیں ہوتے کیوں کہ ان کا معمول ہے جب اچھی طرح بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتے ہیں اور کچھ بھوک ابھی باقی ہوتی ہے، وہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔“ حسن بڑے غور سے ماموں جان کی بات سن رہا تھا کہ اس کی امی جان ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ بولیں۔ ”حسن نبی کریم کی اس بات سے ہمیں بڑا اہم سبق ملتا ہے۔ دیکھو نا! اگر کوئی مشین ہر وقت چلتی رہے تو اس کی کارکردگی متاثر ہوگی اور اس میں جلد ہی نقص پیدا ہو جائے گا۔ یہی حال معدے کا ہے۔ ماموں نے بالکل صحیح کہا ہے۔ ہمارا معدہ بھی ایک مشین کی طرح ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے سے یہ مشین خراب ہو جاتی ہے۔ کھانا کھانے میں وقفہ رہے اسے آرام کا موقع ملتا رہے تو کارکردگی بھی بہتر رہے گی۔“ حسن کی سمجھ میں ساری باتیں آ گئی تھیں۔ ماموں جان کے خاموش ہوتے ہی امی جان نے کہا۔ ”مجھے امید ہے بیٹا کہ آئندہ تم بے وقت کھانا نہیں کھاؤ

بھولے بھیا گئے ساہیوال

(غلام مصطفیٰ قادری، لاہور)

جمعہ کا دن تھا اور شام کا وقت۔ گھر میں سب اکٹھے چائے پی رہے تھے کہ امی بولیں۔ ”زاہد بیٹا..... آپ کی خالہ جان کا فون آیا ہے کہ انہیں ساہیوال سے یہاں لے آؤ۔ وہ بے چاری اکیلی یہاں نہیں آسکتیں۔“

”کیا..... ساہیوال.....؟“ زاہد اچھل پڑا۔

”جی ہاں..... ساہیوال..... کیا پہلے کبھی ساہیوال نہیں گئے؟“

”گیا تو ہوں مگر خالہ جان کا گھر کہاں ہے، یہ بھول گیا ہوں۔“

اوہو..... کوئی مسئلہ نہیں، میں آپ کو خالہ جان کا پتا دیتی ہوں۔

آپ کسی رکشے والے کو دکھانا..... اسے معلوم ہوا تو ٹھیک..... نہیں

تو کسی دوسرے رکشے والے سے پوچھ لینا، وہ آپ کو چھوڑ آئے گا۔“

”ترکیب تو اچھی ہے..... مگر کب جانا ہے.....؟“

”آج جمعہ ہے، آپ اتوار کو صبح چلے جانا۔ رات خالہ ثریا

کے گھر رہنا اور صبح ان کے ہمراہ واپس آ جانا۔“

”بالکل ٹھیک ہے.....“ زاہد جسے سب پیار سے بھولے بھیا

کہتے تھے خوش ہو کر بولے۔

”اب آپ تیاری کرو، بیگ وغیرہ تیار رکھو! اتوار کو لاری اڈا

سے ساہیوال جانے والی بس میں بیٹھ جانا۔“ امی نے ہدایت کی۔

”ٹھیک ہے۔“ زاہد نے سداوت مندی سے کہا۔

بیگ تلاش کرنے میں انہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ سیف کے

اوپر ہی بیگ پڑا تھا۔ کپڑے، بنیان، موزے سب کچھ بیگ میں رکھ لیا مگر

بھولے پھر آخر بھولے بھیا تھے، موبائل فون کا چارج رکھنا بھی بھول گئے۔

اتوار کا دن آیا تو بھولے بھیا نے امی کا دیا ہوا ہنا جیب میں

رکھا اور لاری اڈا پہنچ گئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اچھی طرح گھر کا

کھل پتا سمجھ کر جاتے مگر کیا کریں بھولے بھیا، بھولنے کے ساتھ

ساتھ جلد باز بھی تھے۔

لاری اڈا پر بسوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ آج چوں کہ

اتوار کا دن تھا، اس لیے لاری اڈا پر رش معمول سے کچھ زیادہ تھا۔

کنڈیکٹر لوگوں کو زبردستی پکڑ کر بسوں میں سوار کرنے کی کوشش کر

رہے تھے اور کئی تو گلا پھاڑ کر شہروں کے نام لے رہے تھے۔ کوئی

فیصل آباد کہہ رہا تھا تو کوئی خانیوال اور کوئی پورے والا.....

ساہیوال جانے والی بسیں تھوڑا آگے تھیں۔

اچانک ایک ہٹا کٹا شخص بھولے بھیا کو پکڑ کر اپنی جیس کی

طرف کھینچنے لگا تو بھولے بھیا گھبرا گئے۔ ”بھائی! کیا کر رہے ہو؟“

”چلو..... چلو..... خانیوال چلو.....“

بھولے بھیا کو زبردستی بس میں لے گیا۔ افراتفری میں

بھولے بھیا بھول ہی گئے کہ انہوں نے خانیوال نہیں، ساہیوال جانا

تھا۔ کنڈیکٹر ان کو بس میں سوار کر کے مزید سوار یوں کی تلاش میں

چلا گیا۔ بھولے بھیا نے امی کا دیا ہوا نکالا، اس میں سب کچھ لکھا

تھا مگر نیچے شہر کا نام نہیں لکھا تھا۔ بھولے بھیا نے ذہن پر بہت

زور ڈالا کہ انہوں نے کون سے شہر جانا تھا مگر یاد نہ آسکا۔ تھک ہار

کر وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔

جلد ہی وہ خراٹے لینے لگے۔

”اٹھو..... بھائی اٹھو کرایہ دو..... کنڈیکٹر نے انہیں جھنجھوڑا تو

وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔“ ”کتنا کرایہ.....؟“ ”آٹھ سو روپے.....“

”کیا.....؟“ بھیا چڑایا۔ ”ساہیوال کا کرایہ تو چار سو روپے ہے۔“

”کیا..... ساہیوال.....؟“ بھائی! یہ بس تو خانیوال جا رہی ہے۔“

دراصل ہوا یہ کہ بھیا آنکھیں بند کیے نیند کی وادی میں پہنچے تو انہیں

خواب میں خالہ جان کا چہرہ نظر آیا جو انہیں ساہیوال آنے پر خوش آمدید

کہہ رہی تھیں۔ اب ان کو یاد آیا کہ انہوں نے ساہیوال جانا تھا۔

کنڈیکٹر نے انہیں وہیں راستے میں اتار دیا اور تاکید کی کہ وہ

ساہیوال والی بس میں بیٹھ جائیں۔ آدھ گھنٹے انتظار کے بعد بس

آتی نظر آئی، خوش قسمتی سے وہ بس ملتان جا رہی تھی۔ بھیا نے

ساہیوال اتارنے کا کہا تو اس نے ہائی بھری۔

ساہیوال آ کر بھیا سیدھے خالہ کے گھر پہنچے۔ خالہ انہیں دیکھ

کر نہال ہو گئیں۔ امی کو فون کرنے کے لیے بھیا نے موبائل نکالا

تو وہ آف ہو چکا تھا۔ بھیا نے بیگ میں دیکھا تو یاد آیا کہ چارج تو

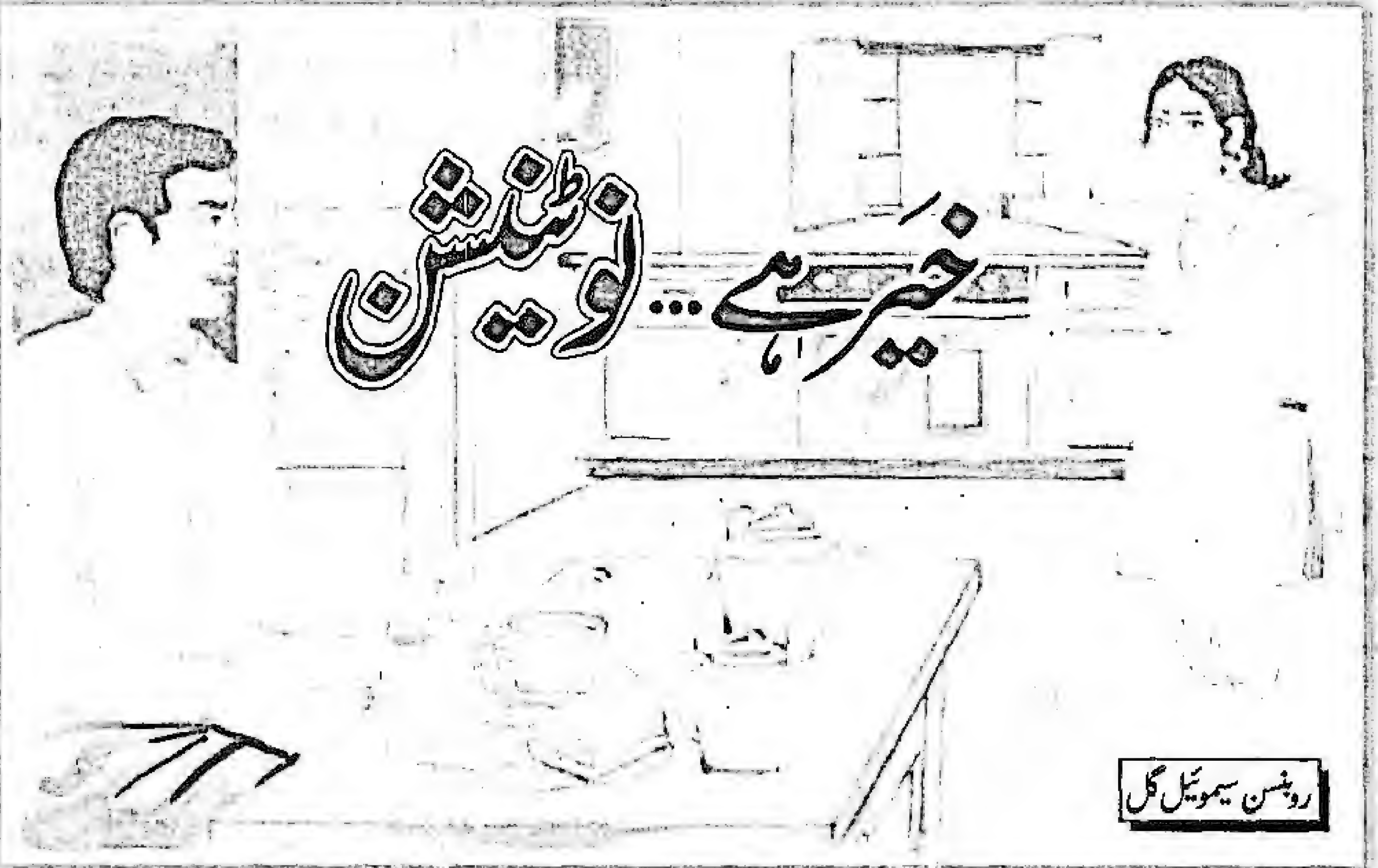
وہ گھر بھول آئے ہیں۔ خالہ انہیں پریشان دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”کیا ہوا.....؟“ ”جی، وہ میں چارج گھر بھول آیا ہوں۔“

”کوئی مسئلہ نہیں.....“ خالہ نے انہیں اپنا چارج دیا۔ موبائل

سے جب انہوں نے گھر فون کیا تو امی ان کی روداد سن کر ہنس ہنس

کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)



مگر مہینوں گزر جاتے کام یوں کاٹوں پڑا رہتا اور بے چارے لوگ چکر پر چکر لگاتے رہتے تھے۔ سرکاری دفاتروں کے رسم و رواج کو سمجھنے والے مجیب کی ٹال مٹول سے یہی اندازہ لگاتے کہ یہ ہائے یانی کا معاملہ ہے مگر دل چسپ بات یہ تھی کہ مجیب رشوت لیتا ہی نہ تھا اور اگر کبھی کسی کے اصرار پر تحفہ سمجھ کر اور ان کی خوشی کی خاطر لے بھی لیتا تو تب بھی کام التواء میں ہی پڑا رہتا۔ اگر متعلقہ شخص تقاضا کرتا یا اس تحفے کی یاد دہانی کرواتا تو وہ مسکراتے ہوئے ایک بار پھر لا پرواہی سے کہہ دیتا۔

”جناب فکر ہی نہ کریں..... کیوں اپنی مینشن لیتے ہیں؟“ اور پھر حیرانی سے پوچھتا: ”اچھا وہ تحفہ آپ نے اس کام کے سلسلے میں دیا تھا۔ چھوڑیں اس کی کیا ضرورت تھی؟ چلیں آپ کی خوشی۔“ اور بے چارہ شخص اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا۔

ایک روز چھوٹے بیٹے وقاص نے پوچھا: ”ابو! آپ نے میری فیس جمع کروادی تھی؟ پچھر پوچھ رہی تھیں۔“ ”اوہ! میرے ذہن سے بالکل نکل گیا، چلو خیر ہے..... نوٹیشن، جلدی کروادوں گا۔“

مینشن والی بات تو تھی کیوں کہ لیٹ فیس میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا مگر کیا کیا جائے مجیب میاں کی ٹال مٹول اور کاموں کو التواء میں ڈالنے والی عادت اس قدر پختہ ہو چکی تھی کہ یہ

”ختم کیوں فکر کرتی ہو؟ ٹھیک کروادوں گا..... خواہ مخواہ مینشن لیتی رہتی ہو۔“

”کیوں نہ فکر کروں، روزانہ صبح باورچی خانہ گیس کی بدبو سے بھرا ہوتا ہے۔ کل کو کوئی حادثہ ہو گیا تو کون ذمہ دار ہوگا؟“ ”اوہ! میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ جو نہی وقت ملا، ٹھیک کروادوں گا۔ تمہارے سامنے ایک دو بار پلمبر کو فون تو کیا ہے۔“

اب وہ مصروف ہے تو میں کیا کروں؟“ ”مجیب نے اپنی اہلیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا مگر وہ بولی: ”دنیا میں وہی ایک پلمبر تو نہیں ہے ناں؟ آپ کسی اور کو بلوا بیجیے، چولہا ہی ٹھیک کروانا ہے، کیا سا کوئی پل بنوانا ہے!“

”اچھا اچھا، کروادوں گا..... ختم مینشن نہ لو۔“ ”مجیب کے یہ چند جملے تھے جو وہ دن میں سینکڑوں مرتبہ ادا کرتا تھا۔ گھر کی بات ہو یا دفتر کی..... بس اُس کا ایک سا حال تھا۔ دفتری کاموں کو التواء میں ڈالنا بھی معمول کی بات تھی۔ سرکاری ملازمت کا یہی بڑا فائدہ تھا کہ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہ تھا۔ چنانچہ جو لوگ بھی دفتری کام کے سلسلے میں آتے انہیں یہی جملے سننے پڑتے۔“

”اوہ..... خیر ہے جناب، مینشن کیوں لیتے ہیں؟“ ”چھوڑیں جی مسئلہ ہی کوئی نہیں، ہو جائے گا آپ کا کام۔“

چھوٹے موٹے نقصان ہوتے ہی رہتے تھے مگر وہ ایسے نقصانوں کو صرف یہ کہہ کر کہ خیر ہے نوٹیشن، آسانی سے بھلا دیتا تھا۔

جمعہ کا روز تھا مسز مجیب اپنی بہن کے ہاں جانے کے لئے تیار ہو رہی تھیں۔ تینوں بچے احسن، وقاص اور گڑیا بھی بڑے خوش تھے۔ جمعہ کی آدمی چھٹی کے باعث مجیب بھی جلد گھر آچکا تھا۔ سب کے سب روانگی کے لئے تیار تھے۔

احسن نے آکر پیغام دیا: ”ابو ہم سب تیار ہیں گاڑی نکالیں ناں۔“ بیٹے کی بات سن کر مجیب گیراج کی جانب بڑھا، گاڑی اشارٹ کی مگر بات نہ بنی۔ بیگم کا پارہ آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔

”جب آپ کو پتا تھا کہ گاڑی ٹھیک نہیں تو مکینک کو دکھا لاتے۔“ ”صبح تو بالکل ٹھیک تھی، نہ جانے اب کیا ہو گیا؟“

”آپ ہر دفعہ پروگرام خراب کر دیتے ہیں، بچے بھی تیار بیٹھے ہیں، ادھر سالگرہ کا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ میرے بھانجے کی پہلی سالگرہ ہے، آخر میری بہن کیا سوچے گی؟“

”اوہو! خیر ہے بیگم..... نوٹیشن، ابھی اشارٹ ہو جاتی ہے گاڑی۔“ یہ کہتے ہوئے مجیب صاحب مسلسل اشارٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انجن سے کھڑ..... کھڑ..... کھڑ..... کی آواز آتی اور اُس کے بعد کچھ نہ ہوتا۔ بونٹ اٹھایا گیا اور حسب روایت بیٹری کے ٹرمینلز کو دبایا گیا مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

”لگتا ہے بیٹری ڈاؤن ہو گئی، لیکن کوئی فکر والی بات نہیں۔ دھکا لگا کر اشارٹ ہو جائے گی۔ چنانچہ دونوں بیٹوں احسن اور وقاص کی مدد سے گاڑی کو دھکا لگا کر گیراج سے نکالا گیا اور پھر گلی میں ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ بے چارے احسن اور وقاص کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ پسینے میں شرابور تھکن سے ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ تب وہاں سے دو رحم دل انسانوں کا گزر ہوا۔ انہوں نے دھکا لگانے میں معاونت کی اور خدا خدا کر کے گاڑی کافی جتن کے بعد اشارٹ ہو گئی۔

مجبیب کے انداز میں فخر نمایاں تھا، جب اُس نے اپنی بیوی سے کہا: ”دیکھا میں نے کہا تھا ناں کہ فکر نہ کرو، گاڑی اشارٹ ہو جائے گی۔“ ثم خواہ مخواہ ہر بات کی ٹینشن لینے لگ جاتی ہو۔

مجبیب آخر ایک باشعور انسان تھا۔ کبھی کبھی اپنی لاپرواہی، مال مٹول اور خیر ہے، پھر سہی، نوٹیشن والی عادت کے باعث ہو جانے

والے نقصان پر پشیمان بھی ہو جاتا تھا، چنانچہ اس عادت پر غالب بھی آنے کی کوشش کرتا مگر ناکام ہی رہتا تھا۔ آخر کار اس کوشش کو بھی یہ کہہ کر پس پشت ڈال دیتا تھا کہ ”خیر ہے..... نوٹیشن!“

ای نے کہا، ”آپ کے ابو گاڑی تیز چلائیں گے تو جلدی پہنچیں گے ناں۔“

گاڑی نے ایک دو بار جھٹکا مارا تھا اور یوں محسوس ہوا کہ بند ہونے لگی ہے، مگر مجیب میاں نے اپنی مہارت سے ریس دہائے رکھی اور انجن بند نہ ہونے دیا۔ اُسے بھی ڈر تھا کہ یہ بند ہوئی تو پھر شاید واقعی فنکشن میں شامل نہ ہو سکیں کیوں کہ فنکشن کا وقت چھ بجے تھا اور اب آٹھ سے بھی اوپر کا وقت ہو چکا تھا۔ مجیب صاحب کے ایک جملے نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔

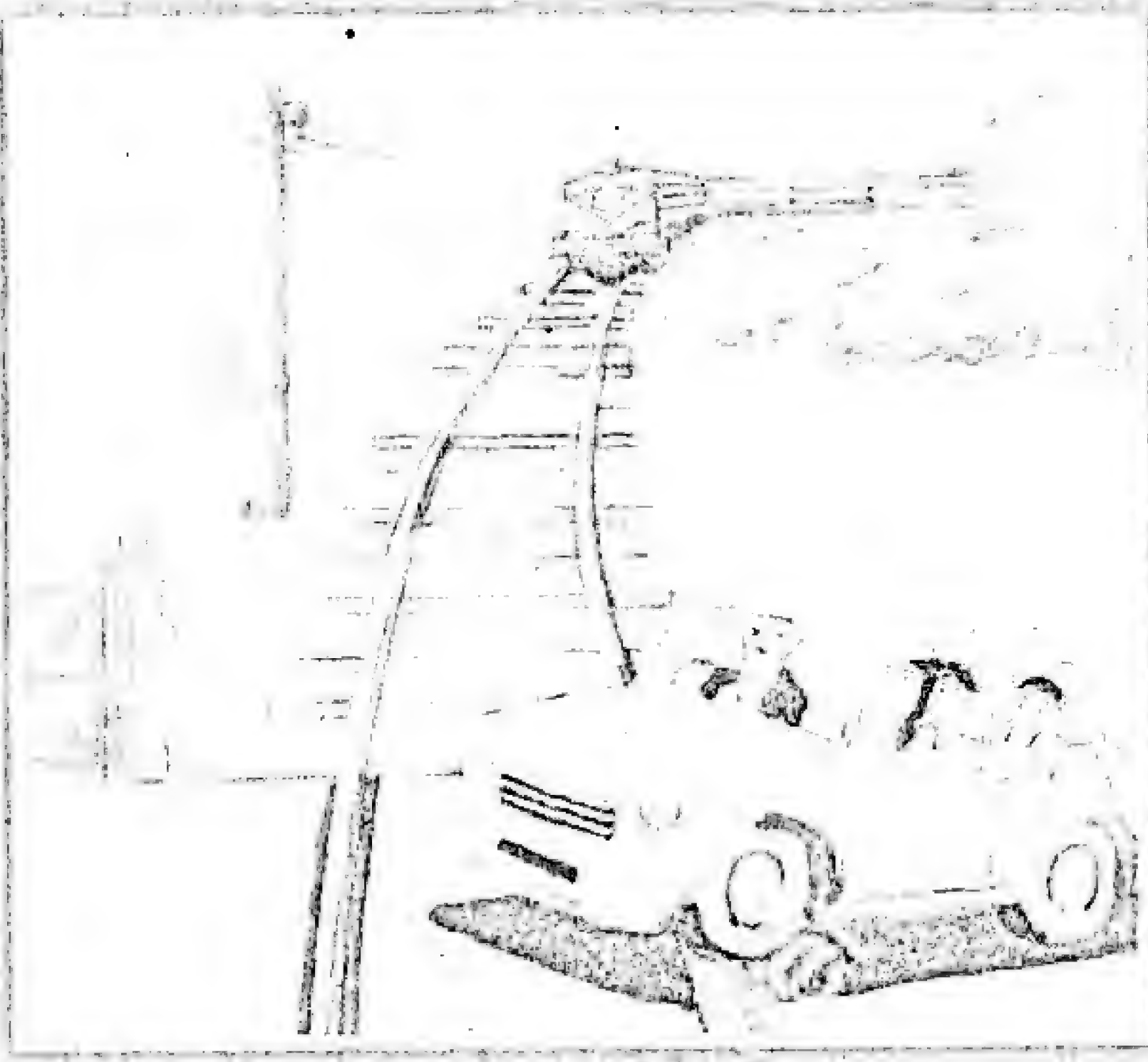
”اوہو، نوٹیشن کی کون سی بات ہے، ہمارے یہاں لوگ کون سا وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔“ ثم دیکھنا ہمارے بعد بھی کئی مہمان تشریف لا رہے ہوں گے۔“

ابھی انہوں نے جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ اگلی گاڑیوں کی رفتار سست ہونے لگی۔

”اس کو بھی ابھی بند ہونا تھا۔“ مجیب نے اسٹیرنگ پر دابنا ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

احسن بولا: ”لو جی، لگتا ہے ٹرین آ رہی ہے، پندرہ بیس منٹ تو کہیں نہیں گھمے۔“

واقعی پھانک بند ہونے والا تھا۔ سامنے کی طرف سے چند گاڑیاں تیزی سے آئیں تو اسی اثناء میں اس جانب کی ٹریفک کو بھی نکلنے کا موقع مل گیا۔ آگے والی گاڑیوں کی رفتار یک دم تیز ہوئی اور حسب روایت سب کوشش کرنے لگے کہ پھانک بند ہونے سے پہلے وہ اُس پار ہو جائیں۔ مجیب بھی ٹریفک کے اسی بہاؤ میں تیزی سے آگے بڑھا، حالانکہ پھانک والا شور مچا رہا تھا کہ ٹرین آنے والی ہے۔ پھانک بند کرنا ضروری ہے مگر ہماری قوم کو ایسے موقعوں پر بہت زیادہ وقت کی قدر کا احساس ہونے لگتا ہے اور ہر کوئی وقت بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورتحال تھی۔ کیا گاڑی، کیا موٹر سائیکل یا سائیکل ہر کوئی اُس پار چلے جانے کا خواہش مند تھا، چاہے اس خواہش کی تکمیل میں جہان سے ہی پار ہو جائے اور پھر وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ریلوے پٹری کے



اوپر سے گزرتے ہوئے عجیب کی گاڑی کو بیچ ایل و
عیال چند جھٹکے لگے اور پھر وہ آگے بڑھنے سے
انکاری ہو گئی۔

رات کی تاریکی کے باعث ریلوے لائن کے
دونوں جانب دور دور تک اندھیرا تھا..... اور پھر
وہی دائیں جانب دکھائی دینے والا اندھیرا ہلکی ہلکی
روشنی سے منور ہونے لگا۔

وقاص چلایا۔ ”ابوثرین آ رہی ہے۔“
اب یہ وہ موقع نہ تھا کہ عجیب میاں اطمینان کے
ساتھ کہہ دیتے، ”خیر ہے..... نوٹیشن۔“
اب تو نوٹیشن، خیر ہے، پھر سہی..... مسئلہ ہی
کوئی نہیں، جیسے جملے نہ جانے کہاں کود گئے تھے۔

اُن کے حلق میں ہی ایک گئے تھے۔ وہ تو سکنے کے عالم میں تھے۔
اگلی والی ٹریفک کب کی پھانک پار کر چکی تھی جب کہ پچھلی جانب
آنے والی چند کاروں کے ڈرائیوروں نے اسی میں عافیت جانی کہ
پسپائی اختیار کر لیں۔ اب سڑکوں پر لکھا ہوا وہ جملہ اُن سب کے لئے
سنہری اصول بن گیا کہ ”دیر سے پہنچنا کبھی نہ پہنچنے سے بہتر ہے۔“
تاریکی کو چیرتی ہوئی ریل گاڑی کی تیز روشنی جوں جوں آگے
بڑھ رہی تھی، اس خاندان کے چراغوں کی روشنی مدہم پڑتی محسوس
ہو رہی تھی۔ عجیب مسلسل چابی گھمائے چلے جا رہے تھے اور ساتھ
ساتھ خشک ہونٹوں پر بار بار زبان بھی پھیر رہے تھے۔ گلے کا بھی
یہی حال تھا..... وہ بھی خشک ہوا پڑا تھا۔

ٹرین سر پر پہنچ چکی تھی اور دونوں جانب سے عوام کے نعرے
چیخ پکار کی صورت میں بلند ہو رہے تھے: ”گاڑی سے نکل آئیں،
اوہ گاڑی سے نکلو..... مرو گے، جلدی کرو ٹرین پہنچ گئی ہے.....
جلدی نکلو..... کیوں مرنا ہے؟“ وغیرہ وغیرہ۔

اسی دوران پھانک والا دوڑ کر دوسری جانب کا دروازہ بند کرنے والا
تھا مگر اس صورت میں ان کی گاڑی دونوں جانب سے پھنس جاتی۔ ٹرین
چند سیکنڈ کے فاصلے پر تھی اور مسلسل ہارن دے رہی تھی۔

احسن بولا: ”ابو گاڑی نیوٹرل کریں ہم دھکا لگاتے ہیں۔“
تب وقاص اور احسن نے بھرپور زور لگا ڈالا مگر گاڑی کے پیچے
پڑیوں پر اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ نکل نہیں پا رہے تھے۔ ابو

بھی اگلا دروازہ کھول کر دھکا لگانے لگے۔

اسی لمحے پھانک والا گیٹ کے بجائے گاڑی کی جانب لپکا اور
دو تین اور نوجوان بھی اپنی موٹر سائیکلیں چھوڑ کر دھکا لگانے کو
پہنچے۔ ریل گاڑی بالکل سر پر پہنچ چکی تھی۔ عجیب صاحب کی اہلیہ
آنکھیں پھاڑے سکتے کے عالم میں اپنی طرف بڑھتی ہوئی ٹرین کو
دیکھ رہی تھیں۔ خوف کے مارے آنے والے پسینے نے اُن کا حلیہ
بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

سب کی کوشش سے گاڑی ٹرین کے پہنچنے سے چند لمحوں پہلے
دوسری جانب بحر غفلت پہنچ چکی تھی۔ عجیب بلکہ اُن کے پورے
خاندان کو یوں لگا کہ گویا انہیں نئی زندگی مل گئی ہو۔

یہی وہ لمحہ تھا جب عجیب نے ایک نئی زندگی گزارنے کا عہد اپنے
دل میں کیا۔ چند لمحوں کے لئے کوئی کچھ نہ بولا۔ سب پر سکتہ طاری تھا۔
سالگرہ پر بھی پہنچ ہی گئے..... اور وقت پر پہنچ گئے مگر عجیب
اُس سارے فنکشن میں خاموش ہی رہا، تاہم اُس کے دل کی تیز
دھڑکن مسلسل گریہ و زاری کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کے حضور معافی
مانگتی اور شکر گزاری پیش کرتی رہی۔

آج اُس کی سستی اور خیر ہے، نوٹیشن کی عادت سارے کے
سارے خاندان کا شیرازہ بکھیر سکتی تھی۔ ایک ایسا بڑا نقصان ہو سکتا تھا جو
ناقابلِ تلافی تھا مگر خدا تعالیٰ نے ایک تلخ اور خطرناک تجربے سے اُسے
زندگی کا سبق سکھا دیا تھا جسے وہ آخری سانس تک بھلا نہیں سکتا تھا۔

میری یاد کے

نزع کی ہچکی کو ذرا غور سے سن
دم ہستی کا خلاصہ اس آہ میں ہے

(زائش خورشید، ایبٹ آباد)

کبھی اے حقیقت منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

(کشف طاہر، لاہور)

ماں باپ سی نعمت کوئی دنیا میں نہیں ہے
حاصل ہو یہ نعمت تو جہاں ظہرِ بدیہ ہے

(الینا قہر، راول پنڈی)

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

(انجم خالد، کراچی)

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلاہ طور تو موجود ہے، موسیٰ ہی نہیں

(حنینہ زاہد، راول پنڈی)

اب کے اس دل میں نہ جاگے گی امید وفا
کبھی آئینے بھی ٹوٹ کر جڑے ہیں بھلا

(شرقت یعقوب، لاہور)

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

(محمد احمد خاں غوری، بہاول پور)

پروانے کو شمع ہلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

☆

اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

(تمنا خضر ساجد، صادق آباد)

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمتِ فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

آزاد مجھ کو کر دے، او قید کرنے والے!
میں بے زباں ہوں قیدی، تو چھوڑ کر دعا لے

(ماثرہ حنیف، بہاول پور)

نہ جانے کون ہمارے لیے دعا کرتا ہے
میں ڈوبتا ہوں تو سمندر اُچھال دیتا ہے

(لانیہ قریشی، راول پنڈی)

اے ساکنانِ شہر! تازہ ہوا کے شوق میں
اتنے نہ در بناؤ کہ دیوار مگر پڑے

(تکلیل الرحمن، شیخوپورہ)

باطل سے دہنے والے اے آسمان نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحان ہمارا

☆

پھلا پھولا رہے یا رب چمنِ میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

(ماریہ عبدالناصر، کٹر کوٹ)

قوتِ عشق سے ہر اپست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

(ملائکہ رانی، جھنگ صدر)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(حرا ظفر، گوجرانوالہ)

یہی درس دیتا ہے ہمیں ہر شام کا سورج
مغرب کی طرف جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے

☆



تعلیم و تربیت الاسلام ٹیم کے لیے ہیں آپ

میرا نام جماعت کا نتیجہ آیا ہے اور میں آپ کی دعاؤں کی وجہ سے پاس ہو گئی ہوں۔ یہ تو میں نے آپ کو اچھی خبر سنائی ہے لیکن مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے۔ میں کئی مہینوں سے آپ کو خط بھیج رہی ہوں لیکن آپ نے میرا خط اب تک شائع نہیں کیا۔ امید ہے اس بار آپ میرا خط ضرور شائع کریں گے۔ (شکریہ) (عدن جواد، جنگ صدر)

میرا نام بلال حسین جٹ ہے اور میں گڑھا موڑ میں رہتا ہوں۔ میں تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا رسالہ ہے ناول "زندہ لاش" نے تو میرا مزادوبالا کر دیا۔ میں اب یہ رسالہ بہت شوق سے پڑھتا ہوں لیکن خط لکھنے کی بہت پہلی بار کر رہا ہوں۔ میرے خط کے لیے جگہ نہ پائی تو میرا نام ضرور شائع کیجیے گا۔

(بلال حسین جٹ، گڑھا موڑ)

ڈیر ایڈیٹر صاحبہ! امید ہے بخیر وعافیت ہوں گی۔ ستمبر کا شمارہ بہ نسبت اگست زیادہ اچھا تھا۔ "فرض" کے عنوان سے کہانی بھیجی تھی مگر شائع نہیں ہوئی۔ اس مرتبہ کہانی بعنوان "کالے شیشے" بھیج رہا ہوں۔ ضرور آگاہ کریں کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں؟

(حضرت امین، پشاور)

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سب قارئین کو اور تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو دلی یوم دفاع مبارک ہو۔ اس مرتبہ بھی شمارہ بہترین تھا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ خاص کر خودداری، سمندر کے راہی، مسجد وزیر خان اور نیند کے مارے تو لا جواب کہانیاں تھیں۔ تمام سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ کھڑکھاند گروپ اور ناول زندہ لاش بہترین ہیں۔ اگر آپ نے میرا خط

شائع نہ کیا تو میری ماما مجھے یہ رسالہ پڑھنے نہیں دیں گی میں اپنے پیارے رسالے سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ (سید محمد عثمان نقیس، گوجرانوالہ)

☆ اب آپ خوش ہیں.....! خط لکھنے کا شکر یہ۔

ایڈیٹر صاحبہ! میں آپ کا یہ رسالہ کافی سالوں سے پڑھ رہی ہوں۔ ہر مرتبہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ میں آپ کو پہلے بھی دو مرتبہ خط لکھ چکی ہوں مگر شائع نہیں ہوا۔ 6 ستمبر میری سالگرہ کا دن ہے اور اسی دن جنگ بھی ہوئی تھی۔ آپ کا رسالہ ہمارے گھر میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ سب اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس دفعہ سرورق بہت زبردست تھا۔ نعت "درونی پر" بہت پسند آئی۔ اس دفعہ کہانیاں خودداری، تعلیم سب کے لیے ہے، آزاد مجھ کو کر دے، اوقید کرنے والے اور بیجو باور بہت اچھی تھیں۔ "نیند کے مارے" کا تو بس پوچھتے ہی منت بہت زبردست تھی اور "کھڑکھاندی مشاعرہ" تو پڑھ کر بہت ہی اسی۔ مسجد وزیر خان پڑھ کر تو وہاں کی سیر ہو گئی اور باقی سب تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ زندہ لاش بہت زبردست سلسلہ ہے۔ محاورہ کہانی سے بہت سے مفہوم سمجھ آتے ہیں۔ پورا رسالہ بہت معلوماتی ہوتا ہے۔ میں کچھ اور چیزیں بھی بھیج رہی ہوں، امید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گی۔ آپ کے رسالے کی اکثر صفحات رنگین نہیں ہوتے۔ میری یہ منہمی سی خواہش ہے کہ پورا رسالہ رنگین شائع کیا کریں۔ میں "آپ بھی لکھیے" میں کبے حصہ لے سکتی ہوں؟ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دینی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین) (خدیجہ نعیم، لاہور)

جو آپ اپنی کہانیاں پوسٹ کر دیں۔

ایڈیٹر صاحبہ! امید کرتی ہوں کہ خیریت سے ہوں گی۔ براہ مہربانی میرے خط کو ردی کی نوکری کی نذر نہ کیجیے گا کیوں کہ میں نے پہلی مرتبہ خط لکھا ہے۔ بہت عرصے سے میرا خط لکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ آج میں نے سوچا کہ کیوں نا لکھ لیا جائے۔ اس ماہ کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ میں نے ہماری کہانیاں پڑھیں، بہت اچھی تھیں مگر ان میں سے کھڑکھاند گروپ، سمندر کے راہی، نیند کے مارے اور آزاد مجھ کو کر دے اوقید کرنے والے بہت ہی اچھی تھیں۔ میں نے ایک کہانی بھی لکھی ہے جو آپ کو بھیج رہی ہوں جس کا عنوان ہے، "سچ کی برکت"۔ براہ کرم ضرور شائع کر دیے گا۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دینی اور رات چگنی ترقی دے۔ (آمین) (میمنہ مقصود بھٹی، گوجرانوالہ)

میں تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو جب میں اسکول سے گھر آتی ہوں تو اپنے بیڈ پر تعلیم و تربیت پا کر میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ بس پھر مجھے یونی فارم، کھانا، بیگ سنبھالنا کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا اور میں صرف تعلیم و تربیت پڑھنے میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ این میری شمل، ذائقہ کارنر اور لطیفے بہت پسند آئے۔ میرا یہ دوسرا خط ضرور شائع ہونا چاہیے۔ (میونہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

محترم ایڈیٹر صاحبہ! میں اس رسالے کا بہت شوقین ہوں بلکہ یوں کہہ لیں کہ اس کے بغیر گزارہ ہی نہیں ہوتا۔ ہر سلسلہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے اور یہ رسالہ بہت دلکش ہے۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ سلسلہ ”آپ بھی لکھیے“ میں اخلاقی سبق والی کہنی کا ہونا ضروری ہے یا کہ اور قسم کی بھی ہو سکتی ہے؟ مہربانی فرما کر جواب ضرور دیجئے گا کیوں کہ میں نے اس رسالے کے لیے ایک تحریر لکھی ہوئی ہے۔ آپ کے جواب سے رہنمائی ہوگی۔ (رانا شاہ زیب احمد)

☆ آپ ہر طرح کی کہانی لکھ سکتے ہیں۔ ضرور بھیجیے۔

میں بالکل ٹھیک ہوں، اُمید ہے کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ میرا نام عبیدہ فاطمہ ہے، میں فیصل آباد میں رہتی ہوں۔ میں پانچ سال سے تعلیم و تربیت کی قاری ہوں لیکن پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں، اُمید ہے کہ آپ میری اوصاف افزائی کریں گی۔ ذرا اپنی ردی کی ٹوکری سے دور رکھیے گا۔ میں نے کھج لگائے کا جواب بھیج رہی ہوں اس دفعہ خودداری، تعلیم سب کے لیے جہت زبردست کہانیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (عبیدہ فاطمہ، فیصل آباد)

جی جناب تو میں ہوں ہما ثانیہ ارشد، اس ماہ کا تعلیم و تربیت بہت اچھا ہے۔ پیارے اللہ کے پیارے منام تو ہر دفعہ ہی ہٹ ہوتے ہیں اور بانی پاکستان تو مجھے بہت ہی پسند آئی تھی کیوں کہ قائد اعظم میرے فورٹ ہیرو ہیں۔ میں قائد اعظم سے بے انتہا پیار کرتی ہوں۔ پلیز ہر دفعہ قائد اعظم کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور شائع کیا کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین)

(ہما ثانیہ ارشد، گوجرانوالہ)

ستمبر کا مہینہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے کیوں کہ اس مہینے میری

ساگرہ آتی ہے۔ اس مہینے کے شمارے کا سرورق دیکھ کر شہیدانِ جنگ (ستمبر 1965ء) کی یاد تازہ ہو گئی۔ کہانیوں میں بچو باورہ بہترین تھی۔ ”زندہ لاش“ اچھا ناول ہے۔ خدا تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین) (سعد علی، لاہور)

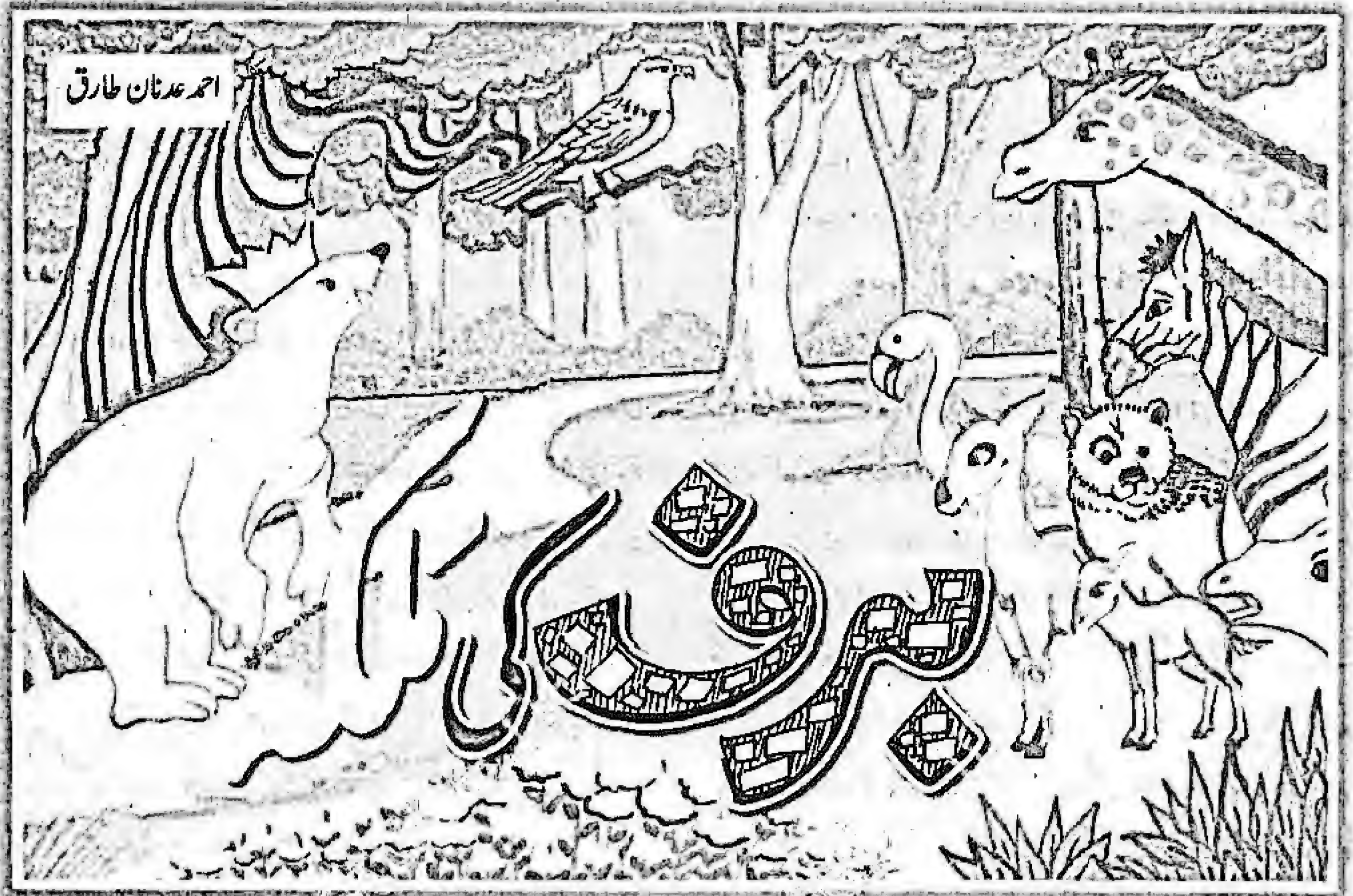
☆ آپ کو ساگرہ مبارک ہو

پیاری ایڈیٹر صاحبہ! کیا حال ہے؟ ہم کئی سال سے یہ پیارا تعلیم و تربیت پڑھ رہے ہیں اور ہم ہر ماہ خط لکھتے ہیں لیکن آپ ہمارا خط شائع نہیں کرتے اور ہر دفعہ ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے ہیں۔ مہربانی کر کے اس دفعہ ہمارا دل بہت توڑیے۔ پلیز! ہمارا خط ضرور شائع کر دیں اور ہاں اس دفعہ خودداری، کھر کھاندی مشاعرہ، نیند کے مارے اور آزاد نگہ کو کر دے، اوقید کرنے والے یہ سب سبق آموز کہانیاں تھیں۔ بچوں کا آئینہ کا بیڈیا ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی بہت اچھا تھا اور آئینے منظر کے پڑھ کر ہنس کر بُرا حال ہو گیا مہربانی کر کے اس دفعہ ہمارا خط ضرور شائع کرنا۔ اللہ آپ کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔ (آمین) (آمنہ عبدالستار، ذیشان احمد، پٹوکی)

میری طرف سے آپ سب کو عید الضحیٰ مبارک ہو۔ اس ماہ کا رسالہ سپر ہٹ تھا کیوں کہ سرورق پر پاک وطن کے بچے نوجوانوں کی تصویریں تھیں۔ پاک فضائیہ کے جیٹ طیارے، ٹینک اور مسلح نوجوان ایسے لگ رہے تھے جیسے دشمن پر حملہ آور ہو رہے ہوں۔ ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ حمد و نعت پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ کہانی خودداری بھی سبق آموز تھی۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ (محمد اشرف، میانوالی)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

حافظہ ثناء عروج، فیصل آباد۔ نصر قاسم، لاہور۔ حافظہ عذرہ سعید چکی، شیخ جی۔ محمد حمزہ لغاری، میانوالی۔ فاطمہ الزہراء، لاہور۔ ابرار الحق، رانہ جنگ۔ صبا شوکت، گوجرانوالہ۔ مائرہ اشرف جو کالیا، محمد سجاد برکی۔ شاہ زیب حسن، پشاور۔ شائستہ مریم، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ایوب، کراچی۔ عثمان جاوید، واہ کینٹ۔ وجیہہ شفقت، اکوڑہ خشک۔ قاری محمد ندیم عطاری، اکوڑہ۔ ملیح شہباز، محمد حمزہ مقصود، طیب مقصود، فیصل آباد۔ امیرہ شاہد، عمیرہ شاہد، گوجرانوالہ۔ محمد سلیم مغل، محمد شاہد جمعہ، لاہور۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ عقیفہ ظفری، ڈیرہ اسماعیل خان، امین فاطمہ، ملتان۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ ثمن رؤف، فیصل آباد۔



خراب ہونے لگا۔ وہ بہت ہی مشرور ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت اپنی کھال کو دھوتی اور چمکتی رہتی تاکہ اس کی کھال مزید سفید نظر آئے۔ اب وہ ہر سال خوب صورتی کا انعام جیتنے لگی۔ ان سالوں میں صرف ایک بار ایسا موقع آیا جب کسی اور جانور نے یہ انعام جیت لیا، کیوں کہ اس سال بہت بارش ہوئی اور مادہ برفانی ریچھ خود سے کہتی: ”مجھے باہر نہیں جانا چاہیے کیوں کہ بارش کی وجہ سے ہر جگہ کچھڑ ہے اور دوسرے جانور کچھڑ سے لت پت مقابلے میں آئیں گے اور میری کھال چھینوں سے گندی کر دیں گے۔“ لہذا اس سال مقابلہ شاید کوئی بطنیا یا مینڈک جیت گیا تھا۔

ہر وقت اس کے ارد گرد نوجوان جانوروں کا ایک جھمکا لگا رہتا جو اس کی تعریف کرتا رہتا۔ اس کی تعریف کرنے والوں میں زیادہ پیش پیش سندری شیر تھے جو اس کی کچھار کے آگے بیٹھے رہتے۔ وہ جب بھی کچھار کے سامنے آتے تو شور مچا کر اس کی تعریف کرتے۔ مادہ برفانی ریچھ کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اپنی سفید کھال سے پیار تھا۔ اب اگر ذرا سی بھی مٹی اڑ کر اس کی کھال پر پڑتی تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتی۔ کئی دفعہ تو اس کے آنسو نکل آتے اور وہ سب کو کہتی: ”میں کیسے اُمید کر سکتی ہوں کہ اس ملک میں میں خوب صورت

اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جانور اور انسان بھی بنائے۔ دنیا کے یہ جانور ہر وقت اپنے ارد گرد کے درختوں، پھولوں اور چاند ستاروں کو دیکھ دیکھ کر ان کی تعریف کرتے۔ جب اس طرح کچھ عرصہ بیت گیا تو وہ اکتا گئے۔ اب انہوں نے خود پر توجہ دینی شروع کی اور ایک دوسرے کی مدح سرائی کرنے لگے۔

ہر جانور کی خواہش تھی کہ اس کی تعریف کی جائے اور اسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ دن کا زیادہ حصہ اپنی آرائش و زیبائش میں گزارنے لگے اور پھر جلد ہی جانوروں کے درمیان مقابلہ منعقد ہونے لگا۔ کئی دفعہ انعام چیتے کے حصے آیا تو کئی دفعہ شاہین مقابلہ حسن جیت گیا۔ باقی جانور بھی انعام جیتنے کے لیے محنت کرتے رہے لیکن ایک ایسا جانور ان مقابلوں میں ابھر کر سامنے آیا جس نے ہر سال انعام جیتنا شروع کر دیا اور وہ جانور تھا ایک مادہ برفانی ریچھ جو کہ بالکل سفید تھی۔ برف جیسی سفید تو نہیں لیکن دوسرے جانوروں سے کہیں زیادہ سفید۔ ہر کوئی اس کی تعریف میں جتا تھا لیکن اندر ہی اندر اس سے حسد کرتا تھا۔ سب اسے کہتے کہ اے برفانی ریچھ! تم اپنی سفید اور ملائم کھال کی وجہ سے ہم سب سے زیادہ خوب صورت ہو۔ یہ تعریفیں سن سن کر برفانی ریچھ کا دماغ

سب جانور تو اس کی تعریفیں سن کر اس سے حسد کرتے ہی تھے لیکن ایک پرندہ ایسا بھی تھا، جو حسد میں سب سے آگے تھا اور وہ تھا سنہری عقاب! وہ بہت ہی زیادہ خوب صورت پرندہ تھا لیکن وہ سفید نہیں تھا۔ بار بار مقابلہ حسن میں وہ مادہ برفانی ریچھ کے بعد دوسری پوزیشن پر آتا اور کئی دفعہ غصے میں بڑبڑاتا: ”کاش برفانی ریچھ یہاں نہ ہوتی تو ہر دفعہ میں فاتح ہوتا۔“ وہ ہر وقت تدبیریں سوچتا کہ کس طرح مادہ برفانی ریچھ سے چھٹکارہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ ہی گئی۔ سنہری عقاب ایک پردہ سی پرندہ تھا جو ہر وقت سفر میں رہتا تھا۔ وہ دنیا کے ہر ملک کو گھوم پھر کر دیکھ چکا تھا اور سبھی جانور اس بات کو جانتے تھے۔ ایک دفعہ وہ مادہ برفانی ریچھ کے پاس آیا اور اسے کہنے لگا: ”میں ایک ایسے ملک کو جانتا ہوں جو تم سے بھی صاف شفاف اور سفید ہے۔ ہاں! مجھے بتا ہے کہ تم بہت سفید ہو مگر وہ ملک تم سے زیادہ سفید ہے۔ اس کی چٹانیں اس طرح چمکتی ہیں جیسے آئینے اور زمین پر سفید برف اس طرح چھٹی ہوئی ہے جیسے دودھ سے بنی آئس کریم۔ وہاں مٹی کا نام و نشان نہیں ہے، نہ ہی گرد و غبار ہے۔ تم

رہ سکتی ہوں۔ یہاں کی مٹی کی وجہ سے تم نے مجھے بھی مکمل صاف شفاف نہیں دیکھا۔ تم نے مجھے جتنا دیکھا ہے میں اس سے کہیں زیادہ سفید ہوں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھے کسی ایسے ملک چلے جانا چاہیے جہاں مٹی نام کی کوئی شے نہ ہو۔ تم ہی بتاؤ، میرے لیے کون سا ملک مناسب رہے گا؟“ وہ اسی طرح کی باتیں اکثر کرتی رہتی کیوں کہ اس کے جواب میں سمندری شیر اسے اکثر کہتے: ”نہیں نہیں، ٹھہرانی فرما کر ہمیں چھوڑ کر مت جانا۔ ہم تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بدلے میں تم جیسا کہو گی ہم ویسا ہی کریں گے۔“ یہ باتیں سن کر مادہ ریچھ خوش ہو جاتی کیوں کہ اس طرح کی لچھے دار باتیں سننا اس کی کمزوری بن چکی تھی۔ سارا دن سمندری شیر اسے گھورتے رہتے اور متاثر ہوتے رہتے اور شام کو جب گھر جاتے تو اس کی نقل کرتے ہوئے خود کو مادہ ریچھ کی طرح ہانسنے کی کوشش کرتے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا کیوں کہ سب جانوروں کے رنگ مختلف تھے۔ کوئی کالا تھا تو کوئی بھورا، کوئی پیلی اور رک کے رنگ کا تھا تو کسی کے جسم پر دھبے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی سفید نہیں تھا۔ اس لیے جلد ہی ان میں سے بہتوں نے خود کو خوب صورت بنانے

کی کوشش ترک کر دی لیکن مادہ برفانی ریچھ کو دیکھنے کی عادت نہ بدل سکے۔ کچھ تو آتی دفعہ پلک کا سامان ساتھ لے آتے۔ وہ درختوں کے نیچے دوسرے مجھے کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ مادہ دریائی بھینسا اپنے بچوں کو کہتی: ”ذرا اس کی طرف دیکھو، تمہیں بھی بڑا ہو کر اس کی طرح خوب صورت بننا ہے۔“ لیکن اب یہ باتیں بھی مادہ برفانی ریچھ کو خوش نہیں کرتی تھیں۔ وہ ٹھنڈا سانس لے کر کہتی: ”یہ مجمع کتنی مٹی اڑاتا ہے۔ میں ان سے کیسے پیچھا چھڑا سکتی ہوں؟ کاش میں کسی صاف شفاف ملک میں جاسکتی۔“



سنہری عقاب اڑتا ہوا واپس دوسرے جانوروں کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ مادہ برفانی ریچھ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی گئی ہے۔ وہ سب بہت خوش تھے اور فوراً خود کو مزید خوب صورت بنانے میں بھٹ گئے۔ ہر کسی کے دل کا خیال اس کے لبوں پر تھا۔ ”اب مادہ برفانی ریچھ نہیں رہی، ہو سکتا ہے اس دفعہ کا انعام میں ہی جیت لوں۔“ سنہری عقاب بھی خود کہہ رہا تھا: ”یقیناً! میں ہی جانوروں میں سے سب سے خوب صورت ہوں۔“ سبھی جانور یہ بھول چکے تھے کہ خدا نے سب کو کچھ نہ کچھ خوب صورتی دی ہے۔ لہذا اگلا مقابلہ کون جیتا؟ ایک بھورا چوہا۔ جو تھا تو بھورا لیکن اس کے بہت خوب صورت گلابی پاؤں تھے۔ ☆☆☆

بقیہ: حضرت عائشہ صدیقہ

پردہ کا بہت خیال رکھتی تھیں، آئینہ حجاب کے بعد تو یہ تاکید فرض ہو گیا تھا۔ جن ہونہار طالب علموں کا اپنے یہاں بے روک ٹوک آ جانا اور رکھنا چاہتی تھیں، آنحضرتؐ کی ایک خاص حدیث کے مطابق اپنی کسی بہن یا بھانجی سے ان کو روضہ پلوا دیتی تھیں اور اس طرح ان کی رضائی خالہ یا ثانی بن جاتی تھیں اور ان سے پردہ نہیں ہوتا ورنہ ہمیشہ طالب علموں کے اور ان کے درمیان پردہ پڑا رہتا تھا۔ ایک دفعہ حج کے موقع پر چند بیبیوں نے عرض کی کہ ”اے ام المومنین! چلے، حجر اسود کو بوسہ دے لیں، فرمایا: تم جا سکتی ہو، میں مردوں کے ہجوم میں نہیں جا سکتی۔“ کبھی دن کو طواف کا موقع پیش آتا تو خانہ کعبہ مردوں سے خالی کرا لیا جاتا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ طواف کی حالت میں بھی چہرہ پر نقاب پڑی رہتی تھی۔ ایک غلام کو مکاتب کیا تھا اس سے کہا کہ جب تمہارا زلفدیہ اتنا ادا ہو جائے میں تو تمہارے سامنے نہیں آ سکتی۔ اسحاق تابعی نابینا تھے، وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عائشہؓ نے ان سے پردہ کیا۔ وہ بولے کہ مجھ سے کیا پردہ، میں تو آپ کو دیکھتا نہیں۔ فرمایا، تم مجھے نہیں دیکھتے، میں تو تم کو دیکھتی ہوں۔ مردوں سے شریعت میں پردہ نہیں، لیکن ان کا کمال احتیاط دیکھئے کہ وہ اپنے حجرہ میں حضرت عمرؓ کے دفن ہونے کے بعد بے پردہ نہیں جاتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ نے سترہ رمضان المبارک 57 ہجری میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ ان کی وفات پر حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا۔ ”سیدہ عائشہؓ کی موت کا غم کس کس نے کیا۔“ تو جواب دیا۔ ”جس جس کی وہ ماں تھیں، اسی کو ان کا غم تھا یعنی تمام مسلمان۔“

اس ملک میں جا کر زیادہ پیاری اور سفید ہو جاؤ گی اور کیوں کہ وہاں کوئی نہیں رہتا، اس لیے ظاہر ہے کہ تم فوراً وہاں کی ملکہ بن جاؤ گی۔“ یہ باتیں سن کر مادہ برفانی ریچھ جوش سے پاگل ہو گئی۔ وہ چلا کہ کہنے لگی: ”واہ واہ! یہ ملک تو لگتا ہے جیسے میرے لیے ہی بنا ہے۔ وہاں مجمع نہیں ہے۔ گرد و غبار نہیں ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ وہاں چٹانیں آئینے کی طرح چمکتی ہیں۔“ سنہری عقاب نے بات کو اور بڑھا دیا اور کہنے لگا: ”چٹانیں آئینے کی طرح نہیں بلکہ یوں سمجھو ہیرے کی طرح چمکتی ہیں اور یارش اس طرح برستی ہے جیسے روئی کے گالے گر رہے ہوں۔“ مادہ برفانی ریچھ سن کر پھر چلائی: ”ابھی! میں اس گھورتے مجمع کو چھوڑ کر اداس مٹی اور گرد و غبار سے دور کتب جاؤں گی۔“ اس نے دوسرے جانوروں کو بتایا کہ وہ یہ ملک چھوڑ کر جا رہی ہے۔ یہاں میں بہت گندی ہو جاتی ہوں۔ پھر سنہری عقاب نے ایک وہیل مچھلی کو کرائے پر لیا تاکہ مسافر کو اس کے ملک چھوڑ دے۔ وہ وہیل مچھلی کے سر پر خود بیٹھ گیا تاکہ اسے راستہ دکھا سکے۔ مادہ برفانی ریچھ اس کے شانے پر بیٹھ گئی اور سمندری شیر اس کی ہزار منت کو کے مچھلی کی دم پر سوار ہو گئے۔ کچھ دنوں کے سفر کے بعد وہ بحر منجمد شمالی پہنچ گئے جہاں ہر طرف برف ہی برف تھی۔ وہاں جانوروں کا ہجوم نہیں تھا اور جس طرح سمندری عقاب نے بتایا تھا، مگر بالکل نہیں تھی۔ ہر چیز خوب صورت، صاف اور سفید تھی۔ مادہ برفانی ریچھ نے دیکھا کہ واقعی چٹانیں سورج کی کرنوں سے ہیرے کی انی کی طرح چمک رہی ہیں۔ وہ وہیل مچھلی سے فوراً اُتری اور بھاگ کر قریبی گلیشیر پر چلی گئی تاکہ سفر کے دوران اپنی کھوئی ہوئی خجیب صورتی بحال کر سکے۔ اس کے بعد آج تک وہ کبھی ایک گلیشیر پر بیٹھی ہوتی ہے تو کبھی دوسرے پر۔ اس کے ساتھ سمندری شیر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی کھال پہلے سے زیادہ سفید ہو گئی ہے اور جوں جوں وہ سفید تر ہوئی ہے سمندری شیر اس کی زیادہ تعریفیں کر رہے ہیں۔ وہ بھی جب خود کو مزید خوب صورت ہوتے دیکھتی تو کہتی ہے: ”میں دوبارہ کبھی اس گد آلود ملک میں واپس نہیں جاؤں گی۔“ اس لیے آج تک وہ وہیں ہے اور اس کی تعریف کرنے والے سمندری شیر بھی۔ یہ تھا سفر برفانی ریچھ کا، برف کی وادیوں میں جانے کا سفر۔ ادھر

سے نکلے ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کو محسوس کرتی ہے۔ اسی لیے جب آپ اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اڑ جاتی ہے۔ تلی کی آنکھیں سر پر ہوتی ہیں اور ان کی خاص بات یہ ہے کہ یہ رنگوں کی شناخت بھی کر سکتی ہے۔ تلی کی خوراک پھولوں کا رس ہے۔ اس کے سر کے نچلے حصے میں ایک نلکی سی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ پھولوں سے رس چوتی ہے اور اس کے بعد نلکی لیٹ لیتی ہے۔ یہ خاص بات صرف تلیوں



شیخ عبدالحمید عابد

کے خاندان سے تعلق رکھنے والے کیڑوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ تلیوں اور دوسرے کیڑوں میں نمایاں فرق ان کے رنگین پردے ہیں۔ یہ رنگ دراصل تلیوں کے پردوں پر موجود مختلف پرتوں کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔ کئی رنگوں کی پرتیں باقاعدہ اور ایک خاص ترتیب سے ہوتی ہیں۔ تلیوں کے جسم میں ایک خاص کیمیائی مادہ ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے دشمنوں سے بچنے یا انہیں ڈرانے کے لیے اپنا رنگ تبدیل کر لیتی ہیں۔

تلی اپنے پردوں کے رنگوں ہی کے ذریعے اپنے جسم کے درجہ حرارت کو برقرار رکھتی ہیں۔ صبح کے وقت جب درجہ حرارت کم ہوتا ہے تو تلی کو گرمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت یہ سورج کی روشنی میں اپنے پردے پھیلا دیتی ہے۔ اس طرح پردوں کے گہرے رنگ سورج کی روشنی کو جذب کر لیتے ہیں۔ کئی تلیوں کے رنگوں سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ نر ہیں یا مادہ۔

تتلیاں صبح کے وقت کچھ تھکی تھکی سی رہتی ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے، یہ جست و چالاک ہوتی جاتی ہیں۔ بعض تتلیاں صبح کے وقت پہلے رنگ کے پھولوں سے رس سمیٹتی ہیں جب کہ دوپہر میں سرخ رنگ کے پھولوں پر بیٹھتی ہیں۔ شام کے وقت واپس پہلے پھولوں پر آ جاتی ہیں۔

دوسرے کیڑوں کی طرح تتلیاں بھی اٹلے دیتی ہیں مگر یہ مرغی کے اٹلے کے برابر نہیں ہوتے بلکہ بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس میں مرغی کے اٹلے کی طرح چوڑہ بھی نہیں نکلتا بلکہ یہ

رنگ برنگی، پیاری پیاری، نازک تتلیاں آپ سب کو اچھی لگتی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ انہیں پکڑ لیا جائے مگر جب انہیں پکڑنے جاتے ہیں تو یہ اڑ جاتی ہیں۔ اڑتی تتلیاں تو اور بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

آئیے! ہم آپ کی ملاقات تلیوں سے کروائیں۔ تلی کیڑوں کی خوب صورت ترین قسم ہے۔ دنیا بھر میں تقریباً دس لاکھ قسم کے کیڑے پائے جاتے ہیں جن میں تلیوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے کیڑوں کی قسمیں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہیں۔ ان میں تلیوں کی قسمیں پندرہ ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔

پاکستان اور ہمسایہ ممالک میں تتلیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی آب و ہوا تلیوں کے لیے بے حد موزوں ہے۔ تتلیاں بہترین ہواباز ہوتی ہیں اور اپنی نازک، پتھریلوں کو اڑنے کے لیے بڑی خوبی سے استعمال کرتی ہیں۔ تتلیاں عام طور پر صرف دن میں اڑتی ہیں، رات میں اندھیرے اور سردی کی وجہ سے انہیں اپنے پروں کو حرکت دینے میں مشکل ہوتی ہے۔

اگر آپ کبھی غور سے تلی کو دیکھیں تو اس کے جسم کے مختلف حصے آپ کو نظر آئیں گے۔ سب سے اوپر تلی کا سر ہوتا ہے۔ اس کے بعد حلق اور پھر پیٹ جو دس چھوٹے چھوٹے حصوں سے بنا ہوتا ہے۔ یہ سب آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔ تلی کا اصل حسن اس کے پردوں میں ہے جو اس کے پیٹ سے جڑے ہوتے ہیں۔ پر بہت نرم، رنگین اور خوب صورت ہوتے ہیں۔ تلی کے سر پر ایک خاص جگہ سے دھاگے

جانے والی قسم ہے۔ یہ امریکہ و میکسیکو، یورپ و ایشیا کے بہت سارے ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ عام طور پر کالے، براؤن اور نارنج رنگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کا سائز عام طور پر 5 سے 7 سینٹی میٹر تک ہوتا ہے۔

یہ روئے زمین پر جسامت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے۔ سائز میں 28 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ بھورے اور سبز رنگ میں پائی جانے والی یہ تہلی زہریلی ہوتی ہے اور انڈونیشیا کے جنگلات میں پائی جاتی ہے۔

(Julia)

امریکہ میں پائی جانے والی یہ خوب صورت تہلی پیلے اور نارنج رنگ کی ہوتی ہے۔ اس کا سائز 3 سے 4 انچ تک ہوتا ہے۔

(Mimarch)

تہلی کی یہ قسم بھی زہریلی ہوتی ہے اور دنیا کے زیادہ تر ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کا سائز 8.6-12.4 سینٹی میٹر تک ہوتا ہے۔

(Viceroy)

بھورے اور نارنجی رنگ کی یہ تہلی، شکل کے برعکس مونارک سے ملتی جاتی ہے۔ مونارک کے برعکس یہ زہریلی نہیں ہوتی۔ پروں کے اوپر سیاہ رنگ کا لائن اسے مونارک سے منفرد بناتی ہے۔ یہ کینیڈا اور میکسیکو میں ملتی ہے اور سائز میں 7-7.5 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔

Sewallow T

نمبر ۱

سفید اور سیاہ رنگ کی منفرد قسم ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں پائی جاتی ہے۔ پروں کی کچھلی سائیڈ پر بھی دم اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ یہ سائز میں 5-7 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔

(Post Man Butter Fly)

نمبر ۲

تہلی کی زہریلی اقسام میں سے ایک ہے۔ امریکہ اور برازیل میں پائی جاتی ہے۔ یہ تہلی بھورے اور نارنجی رنگ کی ہوتی ہے۔ سائز 6-8 سینٹی میٹر ہوتا ہے۔

(Scheer Dog Face)

نمبر ۱۰

پیلے رنگ کی یہ تہلی جنوبی امریکہ کے علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ سامنے والے پروں کے درمیان میں سیاہ رنگ کا نشان اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ ☆☆☆

انڈا تہلی بننے تک تین مرحلوں سے گزرتا ہے۔ یعنی انڈے سے لاروا، لاروے سے پیوپا اور آخر میں پیوپا سے مکمل تہلی بنتی ہے۔ تہلیوں کی پیدائش یعنی پیوپا سے تہلی بننے کا عمل عموماً جون جولائی کے مہینوں میں ہوتا ہے۔ تہلی صرف چند ہفتوں تک زندہ رہتی ہے۔ بعض تہلیاں چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہتی ہیں۔ تاہم ان کی اوسط عمر تین سے چار ماہ تک کہی جاسکتی ہے۔

تہلیاں پالنا بھی ایک دل چسپ مشغلہ ہے۔ قسم قسم کی تہلیاں جمع کر کے آپ ان سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ دنیا میں کئی عجائب گھروں میں تہلیوں کی مختلف اقسام محفوظ کر کے رکھی گئی ہیں۔ اگر آپ تہلیاں پالنا چاہتے ہیں تو انہیں خرید کر اپنے باغ میں چھوڑ دیں کیوں کہ اپنی شوخ طبیعت کے باعث یہ آپ کے پروں میں بھی جاسکتی ہیں۔ انہیں بلانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے لان میں رنگ برنگ کے پھول لگائیں۔ اس طرح تہلیاں آپ کا باغ چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔

تہلیاں انسانوں کے لیے بڑی کارآمد ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ ذمہ داری دی ہے کہ یہ پھلوں کی پیداوار بڑھاتی ہیں۔ تہلیاں جب پھول پھول پر بیٹھتی ہیں تو پھولوں سے پھل بننے کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ اس طرح تہلیاں ہمارے لیے خوراک تیار کرنے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔

کرہ ارض پر تہلیوں کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں جن میں سے کچھ کی جسامت بڑی اور کچھ کی بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ چند اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(Alexandra Bird)

نمبر ۱

یہ اپنی جسامت کے لحاظ سے تمام اقسام میں سب سے بڑی تہلی ہے۔ اس کا سائز تقریباً 30 سینٹی میٹر تک ہوتا ہے۔ جو کہ بارہ انچ یعنی ایک فٹ تک ہوتا ہے۔

(Mero Psycho Ariana)

نمبر ۱۲

ہلکے براؤن رنگ کی یہ خوب صورت تہلی کرہ ارض پر سب سے چھوٹی تہلی ہے۔ اس کا سائز تقریباً 8 ملی میٹر ہوتا ہے۔ یہ افغانستان میں پائی جاتی ہے۔

(Painted Lady)

نمبر ۱۸

یہ تہلیوں کی خوب صورت اقسام میں سب سے بگڑت پائی

جغرافیہ

گورکھ ہل اسٹیشن



مری کا متبادل ہے۔ جب لال شہباز قلندر کا عرس شروع ہوتا ہے تو زائرین قافلوں کی شکل میں مست قلندر کی دھن پر رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لال شہباز قلندر کے عرس میں پنجاب اور سندھ سے بڑی تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ سیہون کے بازار میں رُک کر کھانا کھایا جاسکتا ہے۔ آخری گاؤں واپسی پانڈھی ہے، جس کے سرسبز کمیت عبور کریں تو پہاڑی موڑ شروع ہو جاتے ہیں۔ سیاح تپتے میدانوں سے گزر کر ان پہاڑوں پر پہنچتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ بھی سندھ کا حصہ ہیں۔ بلند چٹانی سلسلے گاڑی کا راستہ روک لیتے ہیں۔ برساتی نالوں میں پانی کا شور سنائی دیتا ہے اور سڑک کنارے درختوں پر پرندے انجان سیاحوں کو حیرت سے نگلتے ہیں۔

ان پہاڑیوں پر چلتے چلتے ایک نئی دنیا کا آغاز ہو جاتا ہے۔ انسان صدیوں پیچھے ماضی کی طرف چلا جاتا ہے۔ فضا میں سنسان اور خاموش ہیں۔ عجیب و غریب بناوٹ کے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ میالے اور سرخ رنگ کے پتھر مضبوطی سے اُٹے ہیں جیسے کوئی سنگ تراش اپنا کام ادا ہو چھوڑ کر گئے ہوں۔ راستے میں انسان

گورکھ براہوی زبان سے اخذ کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے بھیڑیا۔ کراچی سے 450 کلومیٹر شمال میں اور دادو سے 100 کلومیٹر مغرب کی سمت ایک خوب صورت مقام گورکھ ہل اسٹیشن ہے۔ سطح سمندر سے 5688 فٹ بلند ہونے کی وجہ سے یہاں درجہ حرارت 17 ڈگری سینٹی گریڈ اور جنوری میں منفی 5 ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ یہاں ٹھٹھے پانی کے چشمے اور آبشار موجود ہیں۔ قدرتی مناظر، ماحول اور آب و ہوا کے حوالے سے اسے سندھ کا مری کہا جاتا ہے۔ کراچی سے دادو تک بس سردی یا ریل گاڑی کے ذریعے رسائی آسان ہے۔ دادو سے جوہی روڈ کے راستے یہاں تک کا فاصلہ صرف 94 کلومیٹر ہے جب کہ سیہون سے 140 کلومیٹر اوپر تک جانے کے لیے جیپ بک کرائی جاسکتی ہے۔

گورکھ کا نام سنتے ہی سندھ کے اس علاقے کا تصور ابھرتا ہے جو مری کی طرح سطح سمندر سے بلند اور پہاڑی علاقہ ہے۔ یہاں پر جون جولائی کی سخت گرمی کے مہینوں میں دسمبر کی سردیوں جیسا مزا آتا ہے۔ سرسبز پہاڑی راستے، تیز رفتار ندی نالے اور حسین چراگاہوں کا مسکن یہ علاقہ سندھ کے رہائشیوں کے لیے

بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ بلوچستان کے پہاڑوں سے اونٹوں پر سوار ہو کر آتے ہیں۔ ان کے کپڑوں پر پیوند اور دھجیاں لگی ہیں۔ اکثر کے پیروں میں جوتے بھی نہیں۔ پوٹوں کے چہروں پر صدیوں کی بھوک ہے مگر پاکستانی ہیں اور زبان پر کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں۔ صبر سے روکھی سوکھی کھا لیتے ہیں۔

پہاڑیوں کے آس پاس تالاب بھی نظر آتے ہیں۔ لوگ ان میں پانی جمع کر لیتے ہیں۔ مویشی سایہ دار جگہوں پر آرام کرتے ہیں۔ مقامی لوگ رات کو ان کی حفاظت میں سو جاتے ہیں۔ یہ اپنی زمین اور ہواؤں میں زندہ ہیں۔ اپنے باپ دادا کی دھرتی سے عشق کرتے ہیں اور سو جاتے ہیں مگر ہجرت نہیں کرتے۔

پہاڑیوں کی چڑھائی کے بعد گورکھ کا ہل اسٹیشن شروع ہوتے ہی ہموار میدان اور سرسبز چراگاہیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہواؤں میں گھاس اور جڑی بوٹیوں کی بھینی بھینی مہک پھیل جاتی ہے۔ سرسبز قالین نما گھاس پر پیدل چلنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ سب سے بلند چٹان پر لوہے کی جالیاں لگا دی گئی ہیں جہاں سے دور پار دیکھیں تو پہاڑی سلسلے عجیب دل کشی دکھاتے ہیں۔ چٹانوں پر باغات اور جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔ سرسراتی گھاس میں ٹھنڈی ہواؤں کا راج ہے۔ موسم گرما کی راتیں بھی انتہائی خنک بستہ ہوتی ہیں۔

گورکھ کی صبح کا منظر ناقابل یقین ہوتا ہے۔ جب رات کو بارش ہونے کے بعد جنگل کے پہاڑ نکھر جاتے ہیں، گیلی اور نرم پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے خمار طاری ہونے لگتا ہے۔ پتھر، بادام اور کھوکھوں کے درختوں کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔

یہاں پر الپائن (Alpine)، فلورا (Flora) اور فونا (Fauna) کے پودے بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں سولر انرجی اور ونڈ انرجی بھی کافی مقدار میں پیدا کرنے کی طاقت بھی ہے۔

کھیرتھر پہاڑوں پر جو سب سے زیادہ اونچا مقام ہے وہ 7056 فٹ ہے۔ کھیرتھر کے مقام پر اور بھی بہت سے اونچے مقامات ہیں جن میں کھوہ بے نظیر، کھیرتھر نیشنل پارک، ڈائنوساؤر اسکیلٹن (Skeleton Dinosaurs) اور صحرائ بھی بہت مشہور ہیں۔

جو لوگ سندھ کے اُکھوتے ہل اسٹیشن، گورکھ ہل کا صرف نام سنتے آئے ہیں، ان کے لیے خوش خبری ہے کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک خوب صورت سڑک مکمل ہو چکی ہے اور اب جب جی

چاہے دادو شہر سے صرف تین گھنٹے کی مسافت طے کر کے سطح سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ ہے زائد اس بلند مقام تک آسانی جاسکتے ہیں۔ پہلے اس جگہ پہنچنا بہت مشکل ہوتا تھا مگر اب ہیلی کاپٹر سروس کی شروعات ہونے کے بعد سے یہاں جانا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اب کراچی سے دادو کے لیے دن میں کئی بار ایئر کنڈیشنڈ کوچز روانہ ہوتی ہیں مگر سب سے بہتر وقت رات ایک بجے کا ہے۔ اس طرح سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ آپ اس پرسکون شہر میں وارد ہوتے ہیں۔

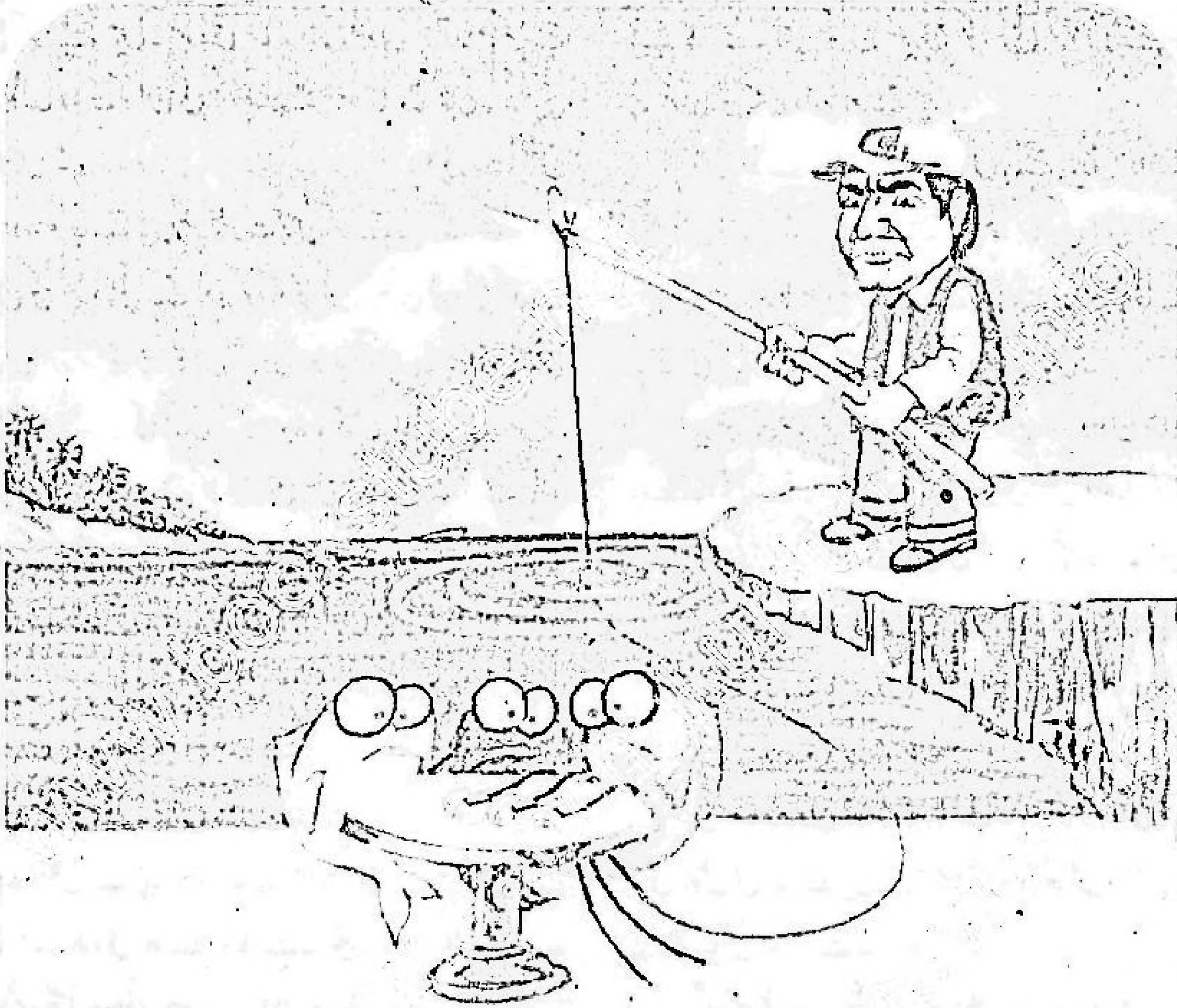
بس اڈے کے پاس پوریاں تلتے ہوئی والے مسافروں کو مخصوص انداز میں بلانے لگتے ہیں۔ بہار کی اس اوس بھری صبح میں پنہری حلوے کا مزہ منہ میں گھلنے لگتا ہے اور گرم چائے کا ایک کپ پیتے ہی سیاح کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

یہ شہر جو صدیوں پہلے ایک زمین دار دادن شاہ گوٹھ کے نام سے تھا، آہستہ آہستہ ایک حسین شہر کی شکل اختیار کرنا جا رہا ہے۔ کشادہ سڑکوں پر کبھی پھروں کی طرح بھنھناتے موٹر سائیکل رکشا والے مسافروں کو دیکھتے ہی لکھیں مارنے لگتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مگر بھرے ہوئے بازاروں میں رات کسی خوشبو کی طرح مہکتی ہے اور سیاح سندھ کی قدیم ثقافت سے سرشار ٹھٹھے، بادلوں کی سریلی گھنٹیاں سنتا پھروں گھومتا پھرتا ہے۔ بازار میں ہی رہائش کے لیے کئی ہوٹل مل جاتے ہیں۔ برصغیر میں گورکھ ہل اسٹیشن تیسرے نمبر پر پُر فضا سیاحتی مرکز ہے۔

گورکھ ہل پر برفباری نے منظر بدل دیئے ہیں۔ سندھ کے ضلع دادو میں واقع گورکھ ہل اسٹیشن پر سیزن کی پہلی برف باری نے منظر کو دل کش بنا دیا ہے۔ ملک بھر میں سردی کی لہر کے بعد ڈھائی ہزار ایکڑ پر پھیلے گورکھ ہل اسٹیشن پر صبح کے وقت جب برف باری ہوتی ہے تو چٹانیں سفید چادر اوڑھ لیتی ہیں اور منظر انتہائی سہانا ہو گیا۔ گورکھ ہل اسٹیشن پر درجہ حرارت رات کے وقت منفی پانچ ڈگری سینٹی گریڈ ہو جاتا ہے۔ 2008ء میں ہونے والی برف باری سے پورا علاقہ برف سے ڈھک گیا تھا جب کہ 2002ء میں بھی اس مقام پر برف باری ہوئی تھی۔ دشوار راستے سیاحوں کے لیے رکاوٹ ہیں۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر جانے کے لیے لوگ مقامی ڈرائیورز سے ہی مدد حاصل کرتے ہیں۔ ☆☆☆

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان
بیجئے کی آخری تاریخ 10 اکتوبر 2015ء ہے۔

ماہنامہ



ستمبر 2015ء کے ”بلا عنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، ان میں سے مجلس
ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، ان عنوانات میں سے یہ سرائشی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے
کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

▶ ارے نادانوا گاڑی نہیں گھٹانوں کو بچاؤ

▶ سیلاب آیا بستی میں ہم اپنی مستی میں

▶ ہمیت مردان، مدد خدا

▶ لکڑی کے سنگ لوہا تیرے

▶ جھوٹے وعدے جھوٹی سلیاں دینا کام ہے میرا

▶ سچ منہ والے عوام کو چھوڑ جانا شعار ہے میرا

(صفی الرحمن، لاہور)

(محمد بزرگ، اول بندری)

(عائشہ ذوالفقار، لاہور)

(نجم اسحر، منڈی بہاؤ الدین)

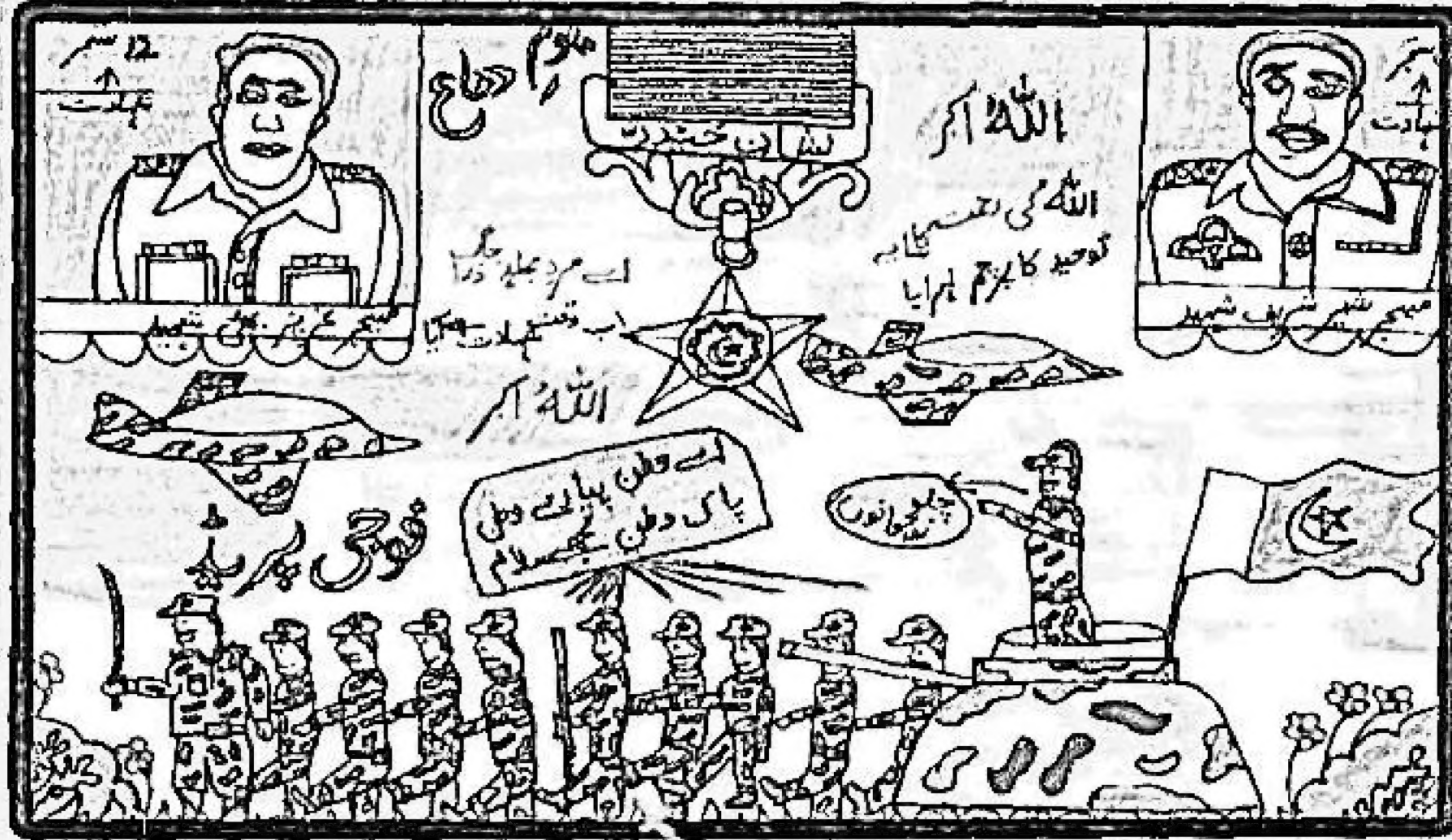
(محمد حمزہ لغاری، میانوالی)



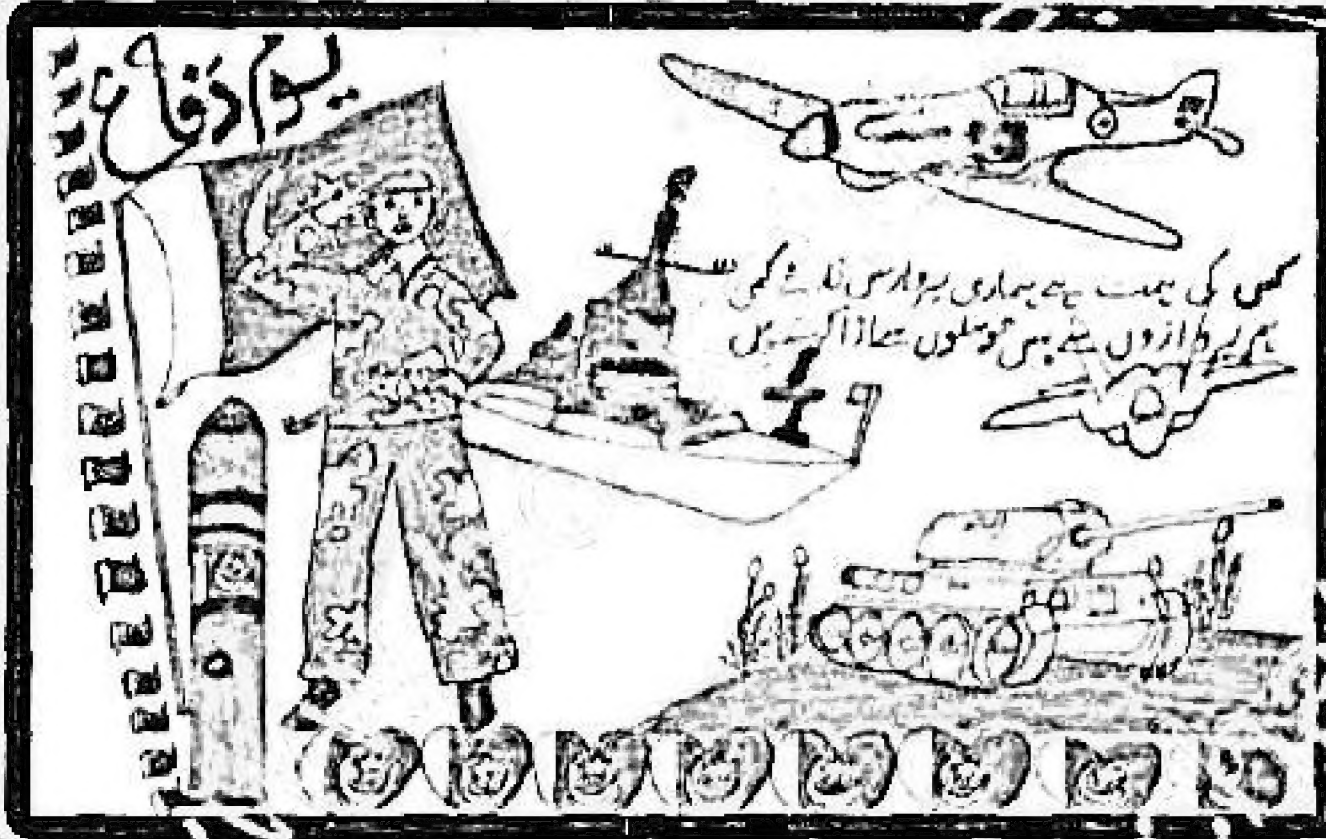
اکتوبر 2015

تصادف صرف اتنی رخ میں ہی بنائیں۔

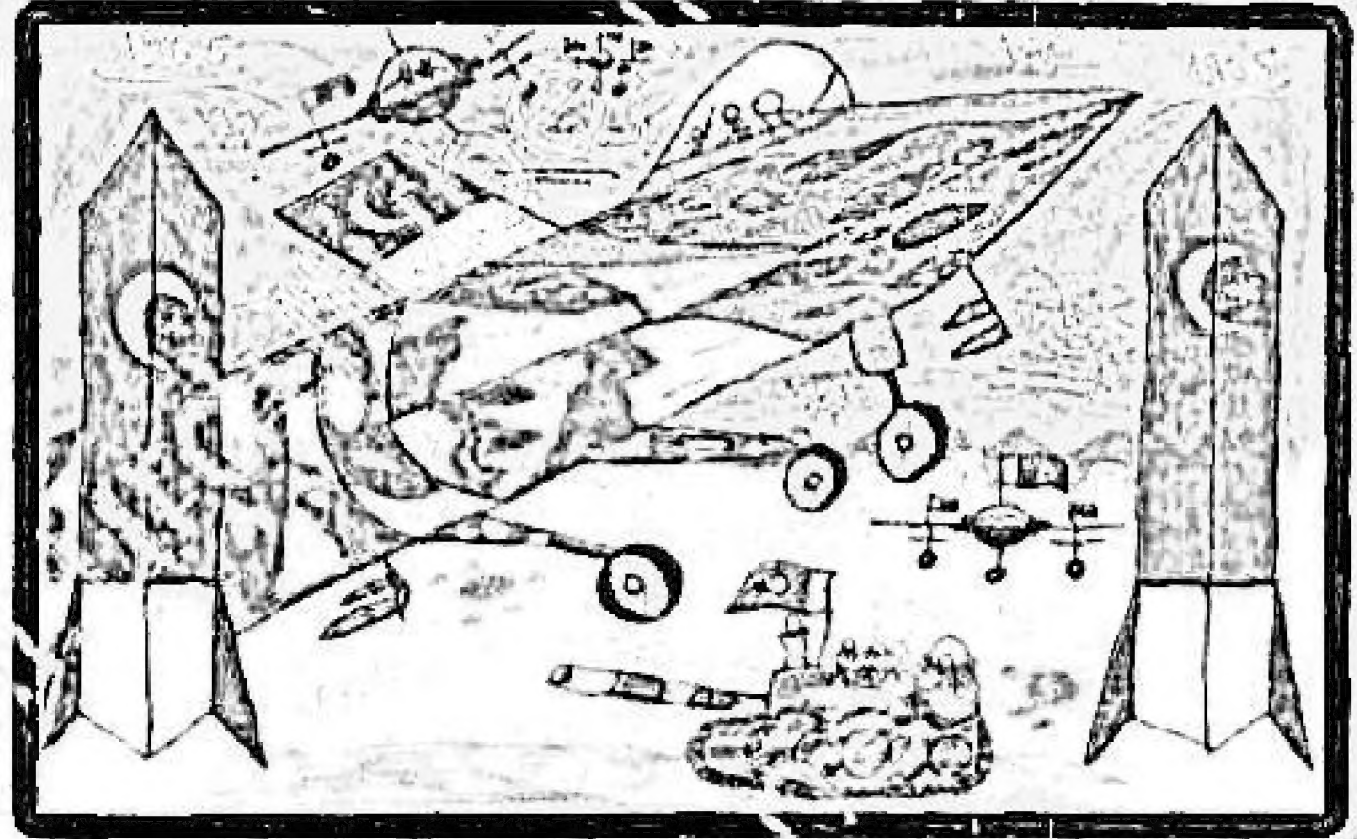
یوم دفاع



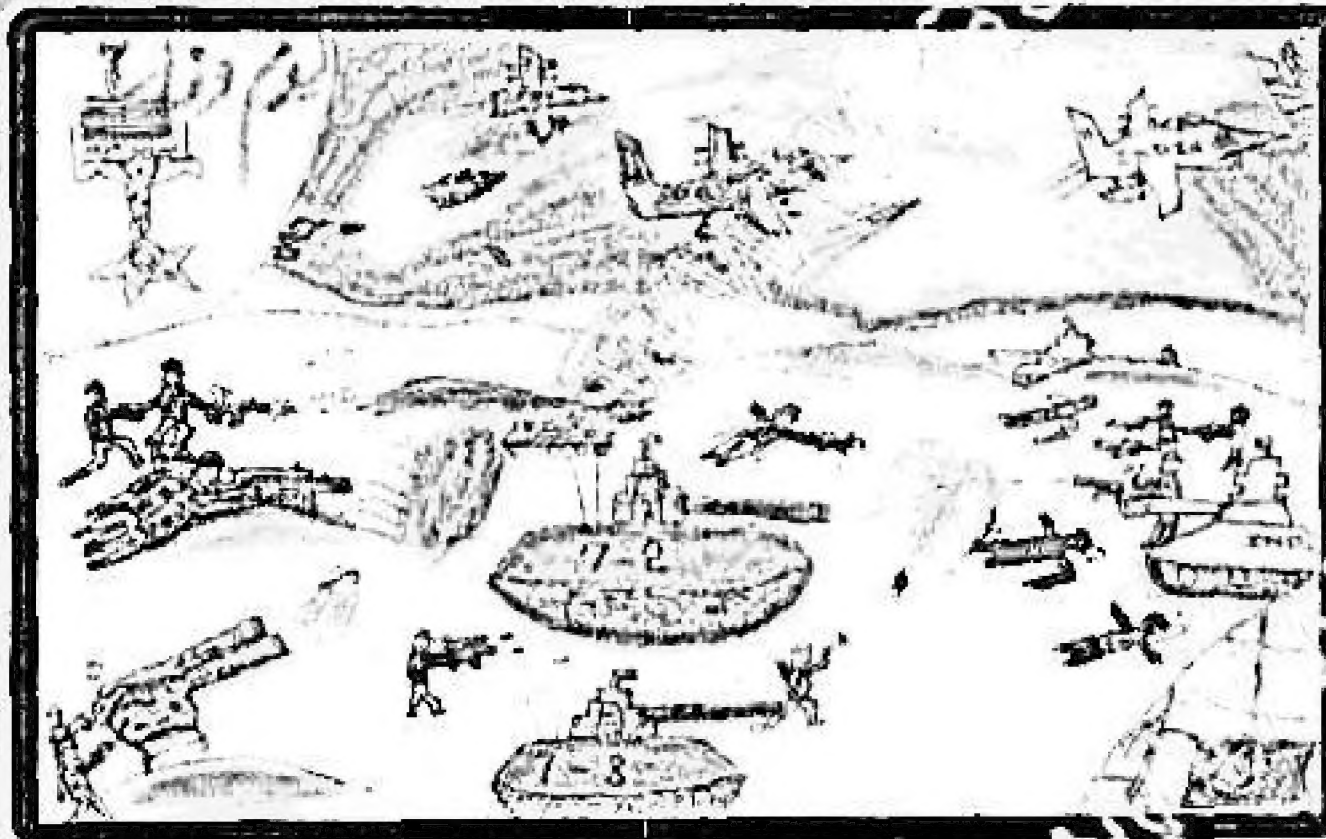
سیدہ تحریم مختار، لاہور (پہلا انعام 195 روپے کی کتب)



جویریہ یونس، لاہور (تیسرا انعام 125 روپے کی کتب)



محمد اسد اللہ، فیصل آباد (دوسرا انعام 175 روپے کی کتب)



عبداللہ ارشد، گوجرانوالہ (پانچواں انعام 95 روپے کی کتب)



خدیجہ نعیم، لاہور (چوتھا انعام 115 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام یہ ذریعہ قرعہ اندازی: سمیعہ توقیر، کراچی۔ محمد عبداللہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ حسنہ یاسر گوندل، کشف طاہر، جویریہ یونس، لاہور۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ وجیہہ شفقت، اکوڑہ ٹنک۔ حضرت امین، ملتان۔ خدیجہ سلیم، بیرمکل۔ زین احمد قریشی، فیصل آباد۔ محمد عثمان جاوید، واہ کینٹ۔ صدف شاہین، لاہور۔ مبشرہ نسreen، لاہور۔ نوید، فیصل آباد۔ راحیلہ ناز، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ثانیہ نور، کراچی۔ ثناء حسن، ملتان۔ آمنہ کریم، راولپنڈی۔ زاہدہ مظفر، پشاور۔ نمیل احمد، لاہور۔ نورین نیازی، کراچی۔ مجاہد خان، کوہاٹ۔ دانیال منصور، لاہور۔ کلیل احمد، بیرمکل۔ فائزہ سلیمان، اسلام آباد۔ فرزادہ نسreen، کراچی۔ حسن، خان پور۔ عاتکہ، چوئیاں۔ محمد حبیب، لاہور۔ اسماء کلیل، فیصل آباد۔ دانش حسین، کوہاٹ۔ اصغر علی، عارف والا۔ نعیم شہزاد، لاہور۔ ماجد، کینٹ۔ عظیم سرور، ملتان۔ کرن، بہاول پور۔ ابراہیم، کوئٹہ۔ سدرہ محمود، کاموکی۔ سرفراز اقبال، لاہور کینٹ۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ ماسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

نمبر کا موضوع
مزار اقبال

اکتوبر کا موضوع
کول کے والا

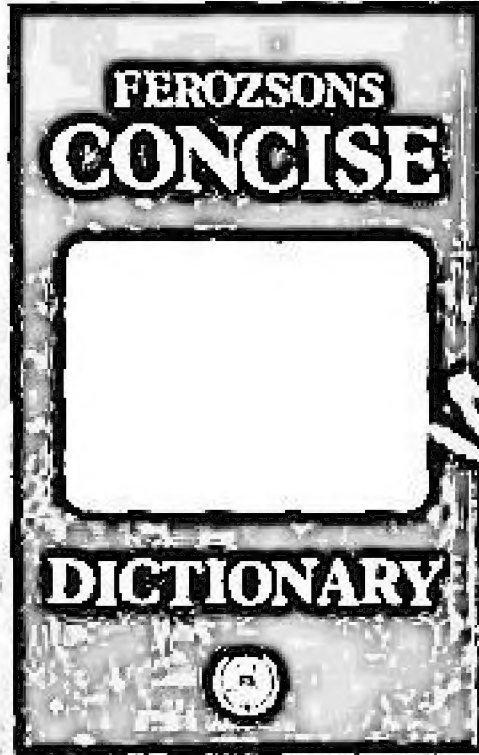
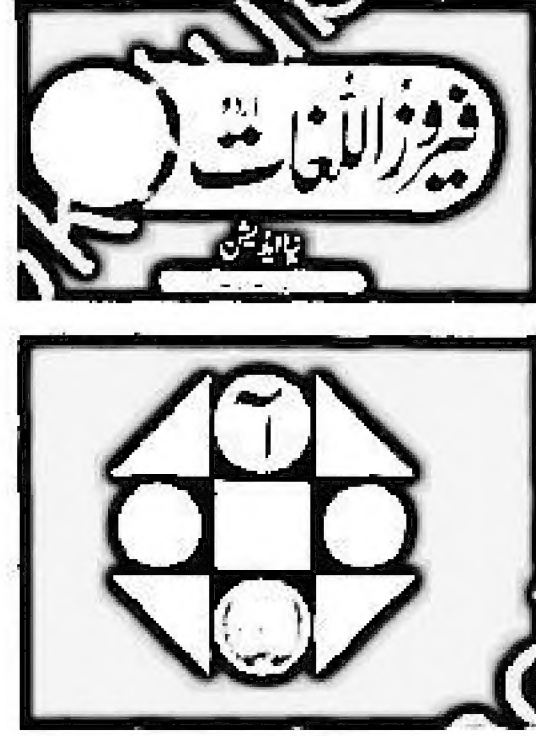
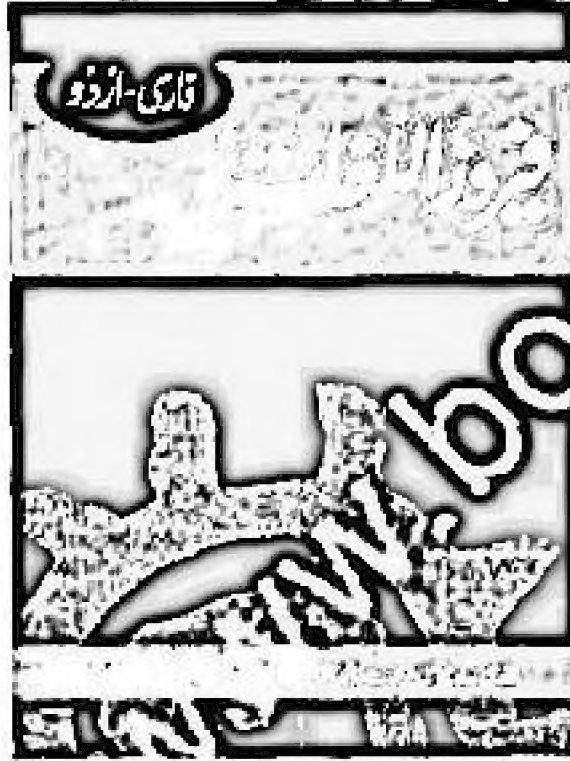
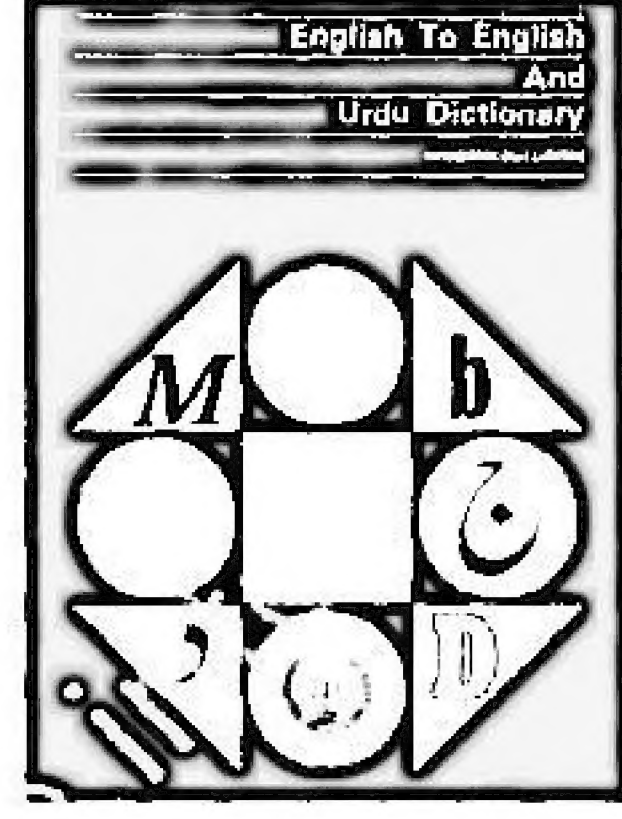
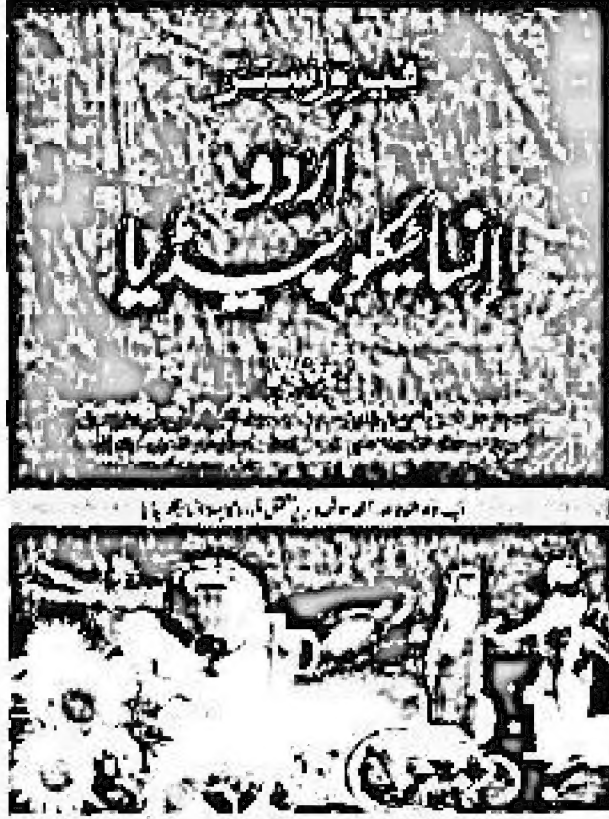
آخری تاریخ 8 نومبر

آخری تاریخ 8 اکتوبر

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES

طلبہ و طالبات کے لیے فیروز سنز کی معیاری لغات



فیروز سنز پریس، لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

